ستارہ سی کوئی

سلیم فگار

ستارہ سی کوئی شام

ستارہ سی کوئی شام

اسے بستی سے باہر جنگلوں میں دفن کر آؤ
مرے لوگوں کو یہ غربت بہت سفاک کر دے گی

سلیم فگار

سانجھ

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں،
مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب برقی
کتب (Pdf) کے حصول کے لیے ہمارے
وٹس ایپ گروپ میں شمولیت اختیار کریں
ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 0347-8848884
حسنین سیالوی : 0305-6406067
سدرہ طاہر : 0334-0120123

ستارہ سی کوئی شام　　شاعری　　سلیم فگار

اشاعتِ اوّل : 2015ء

ٹائٹل ڈیزائن : سعید ابراہیم

تعداد : 500

قیمت : 500

sitarasikoishaam2015@gmail.com

Sitara si Koi Sham
(Urdu Poetry by Saleem Figar)

Copyright © 2015- 1st Edition

Except in Pakistan this book is sold subject to the condition that it shall not, by way of trade or otherwise, be lent, resold, hired out or circulated without the consent of the author or the publisher in any form of binding or cover other than that in which it is published.

Printed by:
Haji Hanif Printers, Lahore Pakistan.

Price:
In Pakistan: Rs. 500.00

Published by:

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323. Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com
Web: www.sanjhpublications.com

ISBN: 978-969-593-143-1

انتساب

ابا جی کے نام
جو شام سے پہلے سو گئے
اماں کے نام
جن کے گیلے خواب میں نے اپنی آنکھوں میں رکھے
وفا پرست شریکِ حیات
بیٹے حمزہ اشرف
اور
شاویز اشرف
کے نام

فہرست

پیش لفظ — سلیم فگار — 13
سلیم فگار میری نظر میں — اقبال کوثر — 15
کھرے جذبوں کا شاعر — خورشید رضوی — 17
روشن امکانات کا شاعر — سید انصر — 20
"ستارہ سی کوئی شام" — شہباز خواجہ — 22

شاعری

حمدِ باری تعالیٰ — 29
نعتؐ — 31
نعت — 33
سلام — 34
کہیں آنکھیں، کہیں بازو، کہیں سے سر نکل آئے — 35
غموں کی آگ پہ سب خال و خد سنوارے گئے — 38
سبھی نحیف دریا کے دھارے کی بات کر — 40
محبت ہے جبھی تو۔۔۔ — 42
کتابِ عمر سے یوں استفادہ کر رہا ہوں میں — 45
اندھیرے کو نگلتا جا رہا ہوں — 47
قرطاسِ دل پہ اُس کے یوں تحریر ہو کے میں — 48
لوٹ آنا — 51
ہوا — 53
آواز دے کے خود کو بلایا نہیں گیا — 55

اب دیکھیے کہ دستِ ہنر کب نظر کرے
ہم چاک پر ہی سوکھ نہ جائیں دھرے، دھرے

خود پر بھی پوری طرح ابھی کب عیاں ہوں میں	57
عذاب اک ہر گھڑی ہے ساتھ اپنے	59
اے جہلم دریائے جہلم	61
چمکے گا کوئی کیسے سرِ خاک ستارہ	65
شام ڈھلتے ہی ترے دھیان میں آ جاتا ہوں	67
فلک سے اب تو نیا جسم ہی اُچھال کوئی	69
آخری پڑاؤ	71
خروٹ آباد	74
ابھی تک بے اماں رکھے ہوئے ہیں	77
خوشبو سا کوئی دن تو ستارہ سی کوئی شام	79
سفر نشیب سے سوئے فراز ہوتے ہوئے	81
بڑا ہی خوف آتا ہے	83
خوف	86
کھو دئے ہیں چاند کتنے اک ستارہ مانگ کر	89
یوں نوکِ زباں پر کبھی اظہار نہ رکھتے	91
آج بھی روحیں بھٹک رہی ہیں کھیتوں میں کھلیانوں میں	93
آنکھ میں خواب ڈبوئے میں نے	95
دریائے جہلم کے نام	97
زمیں زادو	99
وعدہ	102
دن بھر کی مسافت سے یہ ہارا ہوا سورج	104
یوں گل ہوئے نجومِ درخشاں زمین پر	106
بہت تقسیم ہونی ہے، بہت تفریق ہونی ہے	108
ہوا کے تخت پہ ایسے مجھے بٹھائے گا	110
جانِ محمد	112
مجھے نہ دیکھ تو یوں سیم و زر کے ہالے سے	115
بادلوں کی آنکھ کا یہ ایک قطرہ دیکھنا	117
بدلے ہوئے حالات کا دکھ ہے	119
دیکھیے کس سمت جاتا ہے کنارہ چھوڑ کر	121
غموں کی آبیاری ہو رہی ہے	123
اپنی ماں کے لئے ایک نظم	125
زمین کاٹ دی اور آسمان پھینک دیا	127
دشتِ آب کے آہو دیکھ	129
اب کے صدی گرانی کی ہے	131
تذبذب	133
آئینِ وفاداری	135
گدھ	137
اپنے غم کو اپنی آنکھوں میں بلونا چاہئے	139
ہمارا راستہ تو منزلوں سے دور جاتا ہے	141
پہلے ہی سے جاری ہے یہاں خاک کا ماتم	143
تم سے بھی جڑا سلسلہ کیا اور طرح کا	145
تمہارا پیار مجھے جب سے ہے سنبھالے ہوئے	147
قدم قدم پر غم رکھے ہیں	149
بشر سے ہو کے بہت بدگمان چھوڑ دیا	151
عمرِ رواں	153
جلاوطن	155
سوال	157
بچھڑ کے تجھ سے ابھی تک یہ واہمہ ہے مجھے	159
بہتے ہوئے رستوں کے بھنور سے نہیں نکلے	161
میری آنکھ سوالی کر کے	163
حاکمیت	165
بنتِ حوا	167
ملا ہے مجھ کو پڑاؤ سفر بناتا ہوا	170
ہر قدم آگہی کی سمت گیا	172
ہم اوجِ ثریا پہ بھی اس حال میں اُترے	174
چھاؤں کی طرح دشت میں کس کے ثواب آگئے	176

دید کے بدلے سدا دیدۂ تر رکھا ہے 178
دل کا اُجڑا جہان ہوتا ہے 180
اب تو نیلام مری ذات ہوئی جاتی ہے 182
سچ تو یہ ہے 184
سو تم سے کیا گلہ کرنا 185
تمنا کے جزیرے پر 188
قتل گہہ میں جو ہوا وہ حادثہ اچھا لگا 190
کفن میں ڈھل کے جو چرخے کا سوت بولے گا 192
نہ اپنی کامرانی کا نہ تیری ہار کا موسم 193
آنکھوں کو شناسا کوئی چہرہ نظر آئے 195
آنکھوں سے خواب چھین کے بنجر بنا دیا 197
کہاں یہ چاہا سدا میری دسترس میں رہے 199
چلنا ہے مجھے وقت کی رفتار سے آگے 201
سر اُٹھا کر جب کوئی دریا بھی چل سکتا نہیں 203
گونگے بہرے وقت کو آخر بتانا چاہیئے 205
یہی دعا ہے 207
بے چہرہ 209
کہاں تک اور خود کو اس طرح ٹوٹا ہوا دیکھوں 211
میں نے جو اُس کو چوم لیا تھا جنون میں 213
رُت کوئی شبِ وصل کے آثار دکھائے 215
تاوان 217
تیرے بغیر 219
کہیں پہ ہجر کہیں قربتوں کا موسم ہے 221
یہ گل ہوتے ہوئے شعلے سے کوندیں بجلیاں کیسی 223
وہ چاند چہرہ کبھی میرا آئینہ نہ ہوا 225
وہ آفتابِ آگہی اُبھرا نہیں ابھی 227
خلا میں جب کسی تارے کا دم نکلتا ہے 229
فقط خوابوں کے سندیسے مری آنکھوں میں آتے ہیں 231
چمکتی اوس کی صورت گلوں کی آرزو ہونا 233
نارسائی کی یہ حسرت نہیں جانے والی 235
رستے میں جب اک انہونی پڑ جاتی ہے 237
زیست کتنی کڑی ہوئی ہے یہاں 239
بدن کے عارضی، خستہ مکاں سے نکلا ہوں 241
زندگی کتنی کم نظر ہے یہاں 243
فگارِ دل میں بھڑکتے خیال رہتے ہیں 244
بدن کی آگ پہ ہاتھوں کو تاپنے کے لئے 246
مانا عدو سے برسرِ پیکار میں نہیں 248
ریپلیسمنٹ 250
وراثت 252
زندگی سے مکالمہ 254
کوئی بھی لفظ نہ نکلا تھا ترجمانی کو 257
لمحہ بھر حسرتِ دیدار میں آ بیٹھے ہیں 259
''میں'' کے اندر کتنے ''ہم'' ہیں 261
ہم پر یہ احسان اترتا رہتا ہے 263
استقبال 265
امیگرنٹ 268
تری خاطر کوئی اک عمر سے رستے میں بیٹھا ہے 270
کنارِ آب ملا تھا شفق کا جام لئے 272

سپاس نامہ

میں جناب ڈاکٹر طارق عزیز صاحب، برادرم اقبال احمد قمر صاحب، جناب سیّد انصر صاحب **اور** جناب شہباز خواجہ صاحب کا بہت مشکور ہوں جن کی بے لوث محبتوں سے کتاب کی اشاعت کے مراحل میں حائل مشکلات آسان ہوئیں۔

سلیم فگار

پیش لفظ

''ستارہ سی کوئی شام'' میرا پہلا شعری مجموعہ ہے، جو میری اُن غزلوں اور نظموں پر مشتمل ہے جن کا عرصۂ محیط پاکستان سے لندن تک ہے۔ تقریباً سبھی دوستوں سمیت میں نے خود بھی اپنے آپ سے اس کی اشاعت میں تاخیر کا گلہ کیا مگر پھر سوچا کہ جن باتوں کا اختیار ہمارے پاس نہیں اُن پر کڑھنے سے کیا فائدہ۔

سن اور عمر تو یاد نہیں مگر آج بھی جب آنکھیں بند کر کے پیچھے دیکھتا ہوں تو گہرے نیلے آسمان پر اُڑتی ہوئیں رنگ برنگی پتنگیں، سارے ماحول میں سانس لیتی ہوئی شفیق زرخیز مٹی، سبز فصلیں، سرسوں کے پیلے پھول اور کھیتوں کے بیچوں بیچ شریانوں کی طرح بہتی ہوئیں پگڈنڈیاں، دوڑتے، بھاگتے شور مچاتے ہوئے بچے، پرندے، تتلیاں اور کنارے پر کپڑے دھوتی ہوئیں ہر عمر کی عورتیں اور اُن کے پاؤں کو عقیدت اور محبت سے چھو کر بہتا ہوا دریائے جہلم، جس کے چوڑے سینے پر جب دھوپ کی کرنیں اُترتیں تو یوں لگتا جیسے پانی کے روپہلے فرش پر چاندنی کی کوکھ سے جنمی ہوئیں دودھیا سفید چڑیوں کے قبیلوں کے قبیلے بوند، بوند دانہ چگنے کے لئے اُتر رہے ہیں آج کئی برس گزرنے کے بعد بھی یہ منظر میری روح میں اُسی طرح تر و تازہ ہے۔

میرے پورے خاندان میں دور، دور تک کوئی ایک فرد بھی ایسا نہیں جسے شاعری سے شغف ہو اور نا ہی میرا تعلق کسی اہلِ ''زبان'' گھرانے سے ہے، یہ سایہ دار پیڑ میرے شعور میں کب اور کیسے اُگا میں اس خوشگوار حادثے سے مکمل طور پر لاعلم ہوں، میں نے جو کہا اور جو نہیں کہہ سکا، اُسے کہنے کی کوشش میں آج بھی اپنی روح کے تپتے ہوئے صحرا میں آگہی کا کرب سہتا ہوا اَن دیکھی منزل کی طرف مصروفِ سفر ہوں، مجھے اعتراف ہے کہ میرے پاس ایسا کوئی ہنر نہیں جس کی

بنیاد پر میں کوئی دعوی کرسکوں اور نا ہی مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی یا خوش فہمی ہے ہاں اتنا اطمینان ضرور ہے کہ میں نے جو بھی کہا ہے اپنی پوری دیانت داری اور سچائی سے کہا ہے۔

آ گہی اور وجدان کے سفر میں بار ہا ایسا محسوس ہوا جیسے کائنات پگھل کر اُس خاص لمحۂ تخلیق میں ڈھل رہی ہے اور اب میں ہاتھ بڑھاؤں گا تو زمان ومکان کی یہ لامحدود وسعتیں سمٹ کر میری مٹھی میں آ جائیں گی، اک ایسا سرور، اک ایسی کیفیت، اک ایسی شدّت جس کی سرشاری محسوس تو کی جاسکتی ہے مگر اُس کا اظہار پیرایۂ الفاظ میں بہت مشکل ہے۔

''ستارہ سی کوئی شام'' استعارہ ہے سفر میں اُس پڑاؤ کا، جو تلاش ہے میری ذات اور میرے اردگرد بسنے والے انسانوں اور اس کائنات کی ہر جامد و متحرک، زندہ و بے جان شے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اک ایسی اَن دیکھی دنیا کی جس کی پوشیدہ حیرتیں ہر لمحہ مجھے اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہیں، اور اُس لمحے کی جب کن نے فیکون تک کا سفر طے کیا، جب مٹی کی تخلیق ہوئی اور پھر اُس مٹی سے ہمارا خمیر اُٹھایا گیا۔

میں سورج کی دریافت سے بھی کروڑ ہا صدیوں پہلے گہری دھند میں لپٹی کائنات کی سچائی اور اس سچائی کی تہہ میں دبی ہوئی اپنی ذات کو ڈھونڈنے نکلا ہوں اور میں اس سچ سے بھی پوری طرح واقف ہوں کہ ''ستارہ سی کوئی شام'' مجھے کبھی نہیں ملے گی، مگر میں پھر بھی خوش اور مطمئن ہوں کہ میری یہ شکستگی ہی اصل میں نئے جہانوں کی طرف میرے سفر کی کلید ہے۔

سلیم فگار

01:03:2015، لندن

سلیم فگار میری نظر میں

میرے بے شُمار پُرخلوص اور محبتوں والے دوستوں میں سلیم فگار کا خصوصیت سے شُمار ہوتا ہے۔ ذاتی طور پر میں سمجھتا ہوں کہ اِس ایک شخص میں قدرت نے حیرت انگیز طور پر بہت سی ایسی صفات جمع کر دی ہیں جن کا بیان کروں تو یہ اوراق ایک Booklet بن جائیں گے۔

سلیم فگار کا مجھ سے رابطے کا آغاز اور ذریعہ اگرچہ ادب ہی ٹھہرتا ہے مگر ہوتے ہوتے یہ تعلق ادب سے ماوراء ذاتی اور قریبی مراسم کی صورت میں اِس حد تک بڑھ گیا کہ برسوں کی محبتوں کے رشتے میں بدل گیا۔ خاکسار سے تلمذ کی وابستگی کے بعد سلیم کی مجھ سے بے شمار اور پورا، پورا دن نشستیں رہنے لگیں جن کا تسلسل اِس کے بیرونِ ملک جانے تک رہا۔ اس کے بعد یہی نشستیں موبائل فون کے طویل تر رابطوں میں بدل گئیں اور یہ سلسلہ سالہا سال سے آج تک قائم ہے۔

سلیم کو جب میں اپنے باہمی لازوال روابط میں سے دیکھتا ہوں تو مجھے اِس کی ذات اور دوستی پر بے پناہ فخر کا احساس ہوتا ہے اور اپنی قسمت پر ناز کا بھی کہ ایسا انمول اور بے بہا انسان جو کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتا، مجھے کتنی ارزانی سے مل گیا۔

ادب اور اس سے باہر ہر واقفِ حال فرد اور خود سلیم کے سبھی افرادِ خانہ اس پہلو سے لا علم نہیں کہ اس کا میرے ساتھ بے لوث خلوص و وفا، پیار اور ایثار کے سچے اور خالص جذبات کے اعتبار سے کتنا گہرا تعلق ہے۔ اسے میں نے ہمیشہ ایک نہایت نیک نیت، کھرا، با اصول اَنا پسند اور لیے دیے رہنے والا غیّور اور مروّت ومحبت والا انسان پایا ہے۔

جہاں تک میرا معاملہ ہے میں فی الواقعہ اسے اپنی اولاد سے بھی زیادہ ہمیشہ اپنے قریب، اپنے دکھ سکھ میں بہت بڑھ چڑھ کر شریک پاتا ہوں، اور بلا شبہ اسے اپنے حقیقی بیٹوں کی

طرح سمجھتا ہوں۔

میرے اس بیان کردہ تعلق سے کہیں یہ تاثر نہ لیا جائے کہ اس وقت میں اِس کی شاعری کے بارے میں جو اظہارِ خیال کرنے جا رہا ہوں، میں اس سے ان گہرے مراسم کا جانب دارانہ صلہ ادا کر رہا ہوں، تعلق نہ بھی ہوتا تو اِس کے بارے میں میرے یہی ذاتی تاثرات ہوتے۔

سلیم فگار کو تعلیمی دور کی نوعمری میں ہی مطالعے کے ذوق و وجدان نے تخلیقی جذبے سے بھر دیا تھا، بہت سے شعراء کا پسندیدہ کلام اور بطورِ خاص ساحر اور فیض کی تو نظموں کی نظمیں اِسے زبانی ازبر تھیں، لیکن ان اور دیگر تمام شعراء میں سے کسی کے بھی شعری رنگ و اسلوب کا اس کے کلام میں شائبہ تک نہ تھا۔ کسی شاعر کی حسیات میں مختلف شعراء کے شعری مطالعے کی مجموعی صورتِ حال کی بات اور ہے لیکن اپنے شعری اظہار میں میں نے سلیم فگار میں یہ وصف نمایاں پایا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے کلام کی خوشہ چینی یا شعری سٹائل کا تتبع اسے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں۔ جو کچھ وہ لکھتا ہے اُس میں پوری دیانت کے ساتھ خالصتہً اُس کا اپنا طبع زاد رنگ و اسلوب متصرّف ہوتا ہے۔ اِس کا اپنا ہی علامتی و استعاراتی ضابطۂ اظہار ہے جو ایک اپنی ہی قسم کے طرزِ خاص کی جمالیات کا عکاس ہے۔ نظم ہو یا غزل، زندہ روایت کے ساتھ جدّت طرازی اور جدید تر عصری حسیّت اِس کے فکر اور جذبے کی لطافتوں کے ساتھ گھُل مل کر تخلیق پاتے محسوس ہوتے ہیں، غالباً اسی سبب سے اِس کی نظم و غزل کی اکثر لائینیں اور اشعار دامنِ دل چھوئے بغیر نہیں رہتے۔

مجھے مسرّت ہے کہ گہری لگن اور ریاضتِ شعر کا عمل سلیم کی تخلیقی کاوشوں کو ایک تدریجی ترفّع اور ارتقا کے مدّارج سے ہم کنار کر رہا ہے اور وہ اپنی ہم عمر نسل کے جینوئن اور تازہ کار شاعروں کے دوش بدوش شعر و ادب کے نئے امکانات کی طرف پورے اعتماد کے ساتھ گامزن ہے۔

اقبال کوثر
جہلم 2007

کھرے جذبوں کا شاعر

سلیم فگار سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے اُن کمیاب انسانوں میں سے ایک لگا جس کے ظاہر و باطن میں کوئی خلیج حائل نظر نہیں آتی اور جن کے سینے میں سچ مُچ ایک بے غرض اور پُر خلوص دل دھڑکتا محسوس ہوتا ہے۔ سلیم فگار کی شاعری دیکھی تو احساس ہوا کہ وہ تو حقیقت میں اُس سے کہیں زیادہ حساس ہے، جتنا باہر سے دکھائی دیتا ہے۔ اُس کا تعلق ترکِ وطن کرنے والے اُس گروہ سے ہے جس کے خوابوں میں اپنے دیس کی گلیاں، لوگ، دریا اور درخت ہمہ وقت زندہ و موجود ہیں اور جس کے دل پر یہ صدمہ ثبت ہے کہ

لیکن اب تو

ریت نے جیسے زندہ دریا مار دیا ہے

سلیم نے غزلیں بھی لکھیں اور نظمیں بھی اور ان دونوں اصناف کو ایک دوسرے میں خلط نہیں ہونے دیا، مجھے دونوں رنگوں میں اُس کے بہت سے اشعار اچھے لگے۔ دونوں وادیوں میں وہ اپنے کھرے پن کا عذاب سہتا نظر آتا ہے، وہ آرائش و زیبائش سے علاقہ نہیں رکھتا، سادگی کی زلفِ بے گرہ کا اسیر ہے۔

کرن کے اُجلے دامن ہی سے ساتوں رنگ نکلے ہیں
سو خود کو روشنی کی طرح سادہ کر رہا ہوں میں

اس رنگین و بے رنگ روشنی کو وہ حصارِ تیرگی میں اپنے ساتھ رکھتا ہے اور کچے رنگوں کی نمائش میں سادگی کی سمت اختیار کرتا ہے۔ اُس کی غزل کے چند شعر دیکھئے۔

میں نہیں کچھ بھی مگر تیری نظر پڑتے ہی
کوزہ گر میں کسی امکان میں آجاتا ہوں

......☆......

اب آسمان سارا میری دسترس میں ہے
اُنگلی اُٹھا کسی بھی ستارے کی بات کر

......☆......

اُٹھا کے پھرتے رہے ہیں عذابِ در بدری
کبھی بہشت کبھی ذات سے نکالے ہوئے

......☆......

میں پھول بھیجتا تم کو مگر چمن میں مرے
ہری نہ ہوسکی اب کے برس بھی ڈال کوئی

......☆......

شاخ در شاخ تری یاد کی ہریالی ہے
ہم نے شاداب بہت دل کا شجر رکھا ہے

......☆......

چمکے گا کوئی کیسے سرِ خاک ستارہ
ہر بار اُٹھا لیتے ہیں افلاک ستارہ

......☆......

کم ہوتی نہیں تیرگی مٹی کے بدن سے
رکھا ہے کئی بار تہہِ خاک ستارہ

......☆......

دوشِ ہوا پہ اُڑ گئے پنچھی
سُونی پیڑ کی ڈالی کرکے

نظم میں جب رموز وعلائم کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے تو سلیم فگار کی شدّتِ احساس اور بھی

برجستگی سے ظہور کرتی ہے۔ نظم ''خروٹ آباد'' اِس کی موثر مثال ہے جس میں ایک نوزائیدہ بچے کے احساسات کی دل پگھلا دینے والی ترجمانی کی گئی ہے۔

سلیم کے ہاں نثری نظمیں زیادہ پُر زور معلوم ہوتی ہیں، شائد عروضی پابندیاں اُس کے راست اظہار میں حائل محسوس ہوتی ہیں، نثری نظم میں آزادی بہت بڑھ جاتی ہے مگر یہی آزادی سپاٹ پن اور بے اثری کے امکانات میں بھی اضافہ کرتی ہے۔ اس صنف کی کامیابی کے لئے تخلیقی وفور کا بدرجہ اتم پایا جانا ضروری ہے جو اپنے اظہار کے لئے تخلیقی الفاظ بھی اپنے ساتھ بو سکے۔

سلیم کی نثری نظمیں ہیں:

دعاؤں کی چھتری میں
اکثر سوراخ رہ جاتے ہیں

......☆......

میں نے مٹھی کھول کے دیکھی
تو سب لکیریں پتھر سے زیادہ بانجھ نکلیں

......☆......

کل رات احساس نام کا پرندہ
سرد رویوں کی برفیلی گولیوں سے مار دیا گیا ہے

جیسی سطور اُسی تخلیقی خروش کی آئینہ دار ہیں جو نثری نظم کی وجہ جواز ہے۔

خورشید رضوی
۲۶ ستمبر ۲۰۱۳ ساؤتھ ہیمپٹن

روشن امکانات کا شاعر

بیرون ملک مقیم شعرا کے حوالے سے یہ تاثر عام ہے کہ یہ لوگ سطحی قسم کے جذبات پر مبنی عامیانہ اور کچی پکی شاعری تخلیق کرتے ہیں۔ اور اس کے جواز میں یہ دلیل اختیار کی جاتی ہے کہ دوسرے ممالک میں رہنے والے شعراء یہاں کی ادبی فضا سے دُور اپنے معاشرے سے کٹ کرا یسے ماحول میں رہ رہے ہوتے ہیں جہاں انسان مشینوں کی طرح دن رات کام کرتے ہیں۔ مشاعروں میں عدم شرکت یا برائے نام شرکت اور شاعروں ادیبوں کے باہمی میل جول میں کمی معیاری ادب کا مطالعہ اور ادبی سرگرمیوں پر گہری نظر نہ ہونے کی وجہ سے یہ لوگ تخلیقی تحرک کی اُس فراوانی سے محروم رہ جاتے ہیں جو یہاں رہنے والوں کو نصیب ہوتی ہے یہ بات اگرچہ بالکل غلط بھی نہیں لیکن میں اسے سو فیصد درست بھی نہیں سمجھتا کیونکہ میں ذاتی طور پر بیسیوں ایسے شعرا سے واقف ہوں جن کا معیارِ کلام کسی بھی طور پر ادبی مراکز میں تخلیق ہونے والی شاعری سے کم نہیں۔

سلیم فگار بھی ایسے ہی تازہ کار تخلیق کاروں میں سے ایک ہے جس کی نظم و غزل یکساں طور پر جاذبیت کی حامل ہیں۔ اُس نے ہر دو اصناف میں اپنی صلاحیتوں کا بھرپور استعمال کیا ہے۔ نظم کی کوئی لائن ہو یا غزل کا کوئی مصرع زندگی کی قوس قزح کا کوئی نہ کوئی رنگ اُس میں جلوہ فگن نظر آتا ہے۔ کائنات کی وسعتوں کو نورِ بصیرت سے تسخیر کرتا ہوا یہ شاعر افلاک، خاک، چاک، زمین، دریا، پہاڑ، گھاس، گلیاں، گاؤں، شہر، صحرا، سمندر، خس و خاشاک تک سبھی کچھ دامنِ نگاہ میں سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ جب اظہار کرتا ہے تو روزنِ امکان سے کئی صدیوں بعد رونما ہونے والے حقائق پر نگاہ ڈالتا ہے تو کبھی رحمِ مادر میں نمو پانے والے نامکمل جسم کے دُکھ بھی محسوس کر لیتا ہے جو عالمِ خاک پر ظہور پذیر ہونے سے پہلے لقمۂ اجل بن جاتا ہے۔

سلیم فگار اس ملک کی مظلوم اکثریت کے مسائل سے غافل نہیں اس کی اکثر نظمیں دیکھ لیں ہماری اجتماعی مقروضیت اور آئے دن کی قتل و غارت گری، دہشت گردی، بدامنی اور اخلاقی گراوٹ کا نوحہ اور ہماری مجموعی بے حسی کا ماتم جا بجا نظر آئے گا وہ ذات سے کائنات کی طرف محوِ پرواز ہے اسی لئے اُس کے ہاں موضوعات کی محدودیت کا احساس نہیں ہوتا۔

سلیم فگار کی مثال اُس درخت کی سی ہے جس کے برگ و بار سرزمینِ یورپ کی زینت ہیں مگر جڑیں پاکستان کی سرزمین میں پیوست ہیں، وہ اپنا جسمانی رزق تو وہاں سے لیتا ہے مگر اُس کی روح کی غذا اسی زمین کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنا تخلیقی رزق یعنی اپنے شعر کا خمیر آج تک اُسی خاک سے اُٹھا رہا ہے جہاں اُس نے آنکھ کھولی اور زندگی کا طویل عرصہ گزارا۔ اُس کی اکثر شاعری میں وطن اور اہلِ وطن سے دُوری کی کسک نمایاں نظر آتی ہے اور تو اور اُسے دریائے جہلم کی کم ہوتی ہوئی روانی اور کناروں پر چمکتی خشک ریت کا دُکھ بھی اُتنا ہی شدید لگتا ہے جتنا بھوکے پیاسے انسان کا۔ ایسی حسیات کا مالک تخلیق کار مسلسل محنت اور ریاضت سے بہت آگے جا سکتا ہے۔ میری نظر میں سلیم کی یہ تخلیقی کاوش کامیاب رہے گی کیونکہ یہ گہری سوچ رکھنے والے شاعر کی زندگی کا نچوڑ ہے میں اُس کی مزید کامیابی اور سربلندی کیلئے دُعا گو ہوں۔

سید انصر
سرائے عالمگیر (پاکستان)
تاریخ: 26 فروری 2015 بروز جمعرات

''ستارہ سی کوئی شام''

یہ اگست 2006 کی ''ستارہ سی کوئی شام'' تھی جب سلیم فگار سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ مجھے لندن میں آئے ہوئے ابھی چند ماہ ہی گزرے تھے۔ اسی ملاقات میں یہ کھلا کہ ہم دونوں لندن کے علاقے لیٹن میں رہائش پذیر تھے، اور ہمارے گھروں کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہ تھا۔ شعروادب سے وابستگی نے اس پہلی ملاقات کو مسلسل ملاقاتوں میں بدل دیا، اور وقت کے ساتھ ساتھ یہ تعلق گہری دوستی کی شکل اختیار کر گیا۔ اس ملاقات کو آج آٹھ سال سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ اس دوران بیشتر شامیں اکٹھی گزریں، ادبی نشستیں ہوں یا دوستوں کی نجی محافل، میں اور سلیم فگار اکٹھے ان میں شامل ہوتے رہے۔ سلیم فگار سے قائم دوستی پر حالات کی گرد نہ پڑی اور ہر طرح کے مصائب، جو دیارِ غیر میں رہنے والوں کا مقدر ہیں اُن کا مل کر سامنا کیا۔

سلیم فگار کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ وہ ایک اچھے دوست، اچھے شاعر اور انتہائی نفیس انسان ہیں یہی سبب ہے ان کی شاعری پر چند سطریں لکھنے بیٹھا ہوں تو گزشتہ آٹھ برسوں کا منظر نامہ آنکھوں کے سامنے پھیلتا جاتا ہے۔ سلیم فگار کا تعلق سرزمینِ جہلم سے ہے، ایسی زرخیز زمین جس نے جوگی جہلمی، درشن سنگھ آوارہ، گلزار، تنویر سپرا، انجم خیالی، آفتاب اقبال شمیم، اقبال کوثر، شہزاد قمر، نصیر کوی جیسے نابغہ روزگار پیدا کئے۔ سلیم فگار کی ابتدائی شعری تربیت اقبال کوثر کے زیرِ سایہ ہوئی۔ تقریباً پندرہ برس قبل تلاش معاش میں سلیم فگار لندن آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ لیکن شعروادب کی جو چنگاری وہ جہلم سے اپنے ساتھ لائے تھے اسے لندن کی برفاب فضا بھی سرد نہ کرسکی اور انہی کی زبانی:

''اس برف کے موسم میں بھی کیا آگ چھپی ہے
میں ٹھنڈی ہواؤں میں جلا اور طرح کا''

سلیم فگار ایک حساس اور باشعور تخلیق کار ہیں، انہیں اپنے دور کے مسائل کا بھرپور ادراک ہے وہ تیزی سے بدلتے ہوئے انسانی معاشرے اور جذبوں کی ارزانی کے نوحہ گر ہیں۔ ان کی شاعری جہاں ذاتی کرب اور محرومیوں کا اظہار ہے وہاں وہ عصری مسائل کے اظہار سے بھی پہلو تہی نہیں ہیں۔ سلیم فگار کی شاعری میں خاص بات ان کے اسلوب کی سادگی اور فکر کی تازگی ہے۔ انہوں نے بیشتر مقام پر روایتی لب و لہجے سے اجتناب کیا ہے اور حد درجہ کلاسکیت اور فارسی تراکیب سے بچتے ہوئے سادہ اور پُر اثر انداز میں اپنی فکر کا اظہار کیا ہے عصری ادب میں تازہ کاری اور کلیشئے سے اجتناب کی اہمیت سے کون واقف نہیں۔ بقول جناب ساقی فاروقی ''شاعری میں تازگی کی خاطر معنی کو بھی قربان کیا جاسکتا ہے'' لیکن سلیم فگار نے تازگی کے ساتھ ساتھ معنی کو بھی برقرار رکھا ہے۔

سلیم فگار اُن خوش قسمت تخلیق کاروں میں سے ہیں جو غزل اور نظم دونوں اصناف میں اظہار کی قدرت رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی تخلیقی قوت کسی ایک صنف کے دفاع اور دوسری صنف پر تنقید کے بجائے اپنے شعر پر صرف کرتے ہیں۔

سلیم فگار کے مجموعۂ کلام میں کل غزلوں کی تعداد ہے سلاست، روانی اور سادگی ان کا بنیادی وصف ہے۔ ان غزلوں میں آپ کو لاتعداد خوبصورت اشعار نگینوں کی طرح جڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔

عہدِ حاضر کے اہم غزل گو شاعر جناب ظفر اقبال کے مطابق اگر کسی مجموعۂ کلام میں چالیس (40) خوبصورت اشعار موجود ہوں تو اُسے ایک معیاری اور کامیاب مجموعۂ کلام سمجھا جائے گا۔ سلیم فگار کی کتاب ''ستارہ سی کوئی شام'' کو اگر اس معیار پر پرکھا جائے تو یہ ہدف باآسانی پورا ہو جاتا ہے۔ مجھے اس انتخاب میں مشکل پیش نہیں آئی۔ میں ان سب کی نشاندہی بوجہ طوالتِ مضمون نہیں کرنا چاہتا، اور پھر آپ کے چالیس اشعار میرے انتخاب سے مختلف ہو سکتے ہیں، تاہم چند اشعار پیش ہیں۔

کرن کے اُجلے دامن ہی سے ساتوں رنگ نکلے ہیں
سو خود کو روشنی کی طرح سادہ کر رہا ہوں میں

......☆......

یہ لگتا ہے کہ پتوں پر رکھی تھیں منتظر آنکھیں
مرے آتے ہی کتنے پھول شاخوں پر نکل آئے

......☆......

اب آسمان سارا مری دسترس میں ہے
اُنگلی اُٹھا کسی بھی ستارے کی بات کر

......☆......

آواز دے کے خود کو بلایا نہیں گیا
ایسا گیا ہوں لوٹ کے آیا نہیں گیا

......☆......

کیسے شفیق پیڑ تھے کٹنے کے بعد بھی
اُن کا مرے وجود سے سایا نہیں گیا

......☆......

رات ہے جشن مری روح کی آزادی کا
صبح پھر جسم کے زندان میں آجاتا ہوں

......☆......

گرے ہیں جتنے آنسو دامنِ صحرا میں صدیوں سے
سُلگتی ریت بھی اندر سے شائد تر نکل آئے

......☆......

میرے اندر سناٹا ہے صدیوں کی تنہائی کا
وقت کی چیخیں گونج رہی ہیں میرے دونوں کانوں میں

......☆......

اب دیکھئے کہ دستِ ہنر کب نظر کرے
ہم چاک پر ہی سوکھ نہ جائیں دھرے، دھرے

......☆......

کچے رنگوں کی اس نمائش سے
میں اُٹھا سادگی کی سمت گیا

......☆......

اس مجموعۂ کلام میں آزاد نظمیں اور نثری نظمیں بھی شامل ہیں۔ان نظموں میں ''تذبذب''،''عمرِ رواں''،''جلاوطن''،''بے چہرہ''اور زندگی سے مکالمہ جیسی نظمیں اپنے بیانئے اور جذبہ و احساس کی شدّت سے دمکتی نظر آتی ہیں۔اگرچہ سلیم فگار نے غزل اور نظم یکساں کامیابی سے کہی ہیں تاہم ان کی نثری نظمیں اپنے اندر ایک بالکل مختلف رنگ لئے ہوئے ہیں اور آپ کے سامنے شاعر ایک بالکل نئے پیرائیہ اظہار میں سامنے آتا ہے،اور نثری نظم کا یہ حصّہ ان کی باقی شاعری سے ایک قدم آگے بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔

میرے ذاتی خیال میں سلیم فگار کی فکری وسعت اور بے ساختہ اظہار روایتی اصناف کی پابندیوں کو قبول نہیں کرتا اور جہاں جہاں عروض اور قافیہ و ردیف کی پابندی ختم ہوتی ہے اظہار کا ایک نیا در وا ہوتا ہے جہاں خیال اس شدّت اور برجستگی سے ظہور پذیر ہوتا ہے کہ دکھ اور تحیّر کی ایک فضاء قاری کو گھیر لیتی ہے،ان میں ''لوٹ آنا''،''آخری پڑاؤ''،''خروٹ آباد''،''بنتِ حوا''،''ریپلیسمنٹ''اور وراثت''نثری نظموں کا عمدہ نمونہ ہیں۔

نظم''خروٹ آباد''ایک ایسے unborn child کا نوحہ ہے جسے ماں کی کوکھ میں چھلنی کر دیا جاتا ہے۔اس نظم میں اس بچے کے احساسات کو اس مؤثر انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ آنکھیں بے اختیار بھگ جاتی ہیں،چند سطریں دیکھئے:

ہزاروں سال کی بھیڑ سے رستہ بناتا ہوا
میں اس سرائے تک پہنچا تھا
جس سے آگے مجھے
اک اور سفر پر نکلنا تھا

میں تو بس
اپنی آنکھیں، چہرہ اور نامکمل جسم کے
اعضا پورے ہونے کے انتظار میں
ماں کے شفیق وجود کی امان میں تھا!
اتنی روشنی کافی تھی
کہ میں بند آنکھوں سے
اپنے ہاتھوں پر اُگتی ہوئی اُنگلیاں دیکھ سکوں

نظم ''بنتِ حوا'' اُردو ادب میں تخلیق کی جانے والی نسائی نظموں میں ایک اہم اضافہ ہے، خواتین کے خلاف معاشرتی جبر واستحصال کو کتنے مؤثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

قیدی آنکھوں میں التجا کے پھول لئے
اجازتوں کی راہ تکتے، تکتے پنکھڑیاں سوکھ کر
میری روح میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگی ہیں
خدا کے لئے
میری آنکھوں کو زمین کے ساتھ اتنا کس کے مت باندھو
کہ میں آسمان کے رنگ دیکھنا چاہتی ہوں
اور تمہاری آنکھوں میں سلگتی ہوئی اندھی انا کی چنگاریوں کو
اپنی رُوپہلی محبت کی پھوار سے سرد کرنا چاہتی ہوں
پیروں سے اُٹھ کر میرے دل میں
تمہارے چلنے کی خواہش ہے
اور تم مجھے کئی رشتوں کی طنابوں میں جکڑ کر بھی
میری اُڑان سے خوفزدہ ہو
یہ جان کر بھی
کہ اگر پرندوں کے پر کاٹ دیئے جائیں

تو پھر اُن کے لئے
پنجروں کی ضرورت باقی نہیں رہتی
منتوں کا ورد کرتے کرتے
میری زبان کا گوشت گلنے لگا ہے
اور پھر
تمہاری کہنہ روایات کی بیڑیاں
پنڈلیوں کا گوشت کاٹ کر
اب میری ہڈیاں بھی چبانا چاہتی ہیں
میں منہ کے بل گری یا معذور ہوئی تو
احتجاجاً
بانجھ ہو جاؤں گی
اور اگر میں بانجھ ہوئی
تو پھر اپنے جنم کے لئے
آئندہ صدی
تم کس کی کوکھ سے جنمو گے!

سلیم فگار نئی نسل کے اُن شاعروں میں شُمار ہوتے ہیں جنھوں نے جدید اُردو شاعری کے خدوخال کی تزئین و آرائش میں اپنا حصّہ ڈالا ہے، اِن کا شعری مجموعہ اِن کے گزشتہ پچیس برسوں کی تخلیقی کاوشوں اور فکری ریاضت کا نتیجہ ہے۔ میں ان کے اس اولین شعری مجموعے کی اشاعت پر انھیں دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کا آئندہ شعری سفر مزید کامیابیوں سے ہمکنار ہو۔

شہباز خواجہ
اتوار 8 فروری 2015، لندن

حمدِ باری تعالیٰ

فصلِ خزاں میں شاخ سے پتہ نکال دے
سوکھے شجر سے کھینچ کے سایا نکال دے

مجھ کو اماں ہو قریۂ وہم و گمان میں
دے کر یقین دل سے تو، خدشہ نکال دے

چاہے شرر سے پھونک دے سارے جہان کو
چاہے جسے وہ آگ سے زندہ نکال دے

رہبر نہیں ہے اُس سا کوئی دو جہان میں
بحرِ رواں کو کاٹ کے رستہ نکال دے

بے جان پتھروں سے کرے زندگی کشید
دیوارِ خشت و سنگ سے پودا نکال دے

نعتؐ

محمدؐ کی محبت ہی مرا حاصل خزینہ ہے
اسی میں موت ہے میری اسی میں میرا جینا ہے

نظر میں سبز گنبد آیتیں ہیں میرے ہونٹوں پر
سکوت ایسا کہ جیسے ساری دنیا آبگینہ ہے

ہزاروں کہکشائیں ذرّے ذرّے میں سمٹ آئیں
یہ بحرِ نور ہے یا سامنے شہرِ مدینہ ہے

مری کم مائیگی دیوار ہے اظہار میں میرے
بیاں ہوں حالتیں دل کی کہاں مجھ میں قرینہ ہے

بنامِ مصطفیٰ یا رب عطا کر روشنی مجھ کو
اندھیرے غار کی صورت مرا تاریک سینہ ہے

نعت

رب کا نور
مجسم ہو کر
جس پیکر میں اترا ہے
اس کا نام
محمدؐ ہے

سلام

سلام اُن حیدرِ کرار کے
فرزندِ صادق پر
سلام اُن پر
جنہوں نے کربلا کی بانجھ دھرتی کو
لہو دے کر ازل سے تا ابد زرخیزیاں بخشیں
سلام اُس خاک پر جس نے
حسینؑ ابنِ علیؓ کے پاؤں کو چوما

سلام اُن بیبیوں پر جن کے دامن پر
فرشتوں نے عبادت کی
سلام تشنگیٔ معصوم اصغر پر
کہ جس نے کربلا کی حدّتوں کو
آبِ کوثر سے بجھایا تھا
سلام اُن حضرتِ عباس پر جن نے
کٹے بازو تو مشکیزے کو دانتوں سے اُٹھا کر
پیاس کو تکریم بخشی تھی
سلام تشنگی پہنچے
فراتِ صبر کی بے چین لہروں کو
کناروں میں مقید ہو گئی جو حکمِ ربی پر
کہ جن میں آج بھی سوکھے لبوں کی پیاس بہتی ہے!
سلام اُن پر
ہماری آنکھ میں جن کا تصوّر بھی
نمی بن کر اُترتا ہے
سلام اُن پر
کہ جن کا نام لینے سے ہی روحوں میں
عقیدت کے گلابوں کی مہک سی جاگ اُٹھتی ہے
سلام اُن پر
سلام اُن پر

O

کہیں آنکھیں، کہیں بازو، کہیں سے سر نکل آئے
اندھیرا پھیلتے ہی ہر طرف سے ڈر نکل آئے

ہوئے ہیں کھوکھلے ہم لوگ ہجرت میں سو ڈرتے ہیں
خلاء یہ روح کا ایسا نہ ہو باہر نکل آئے

نہ جانے کھول دے کب کوئی لمحہ یاد کی گٹھڑی
کسی کونے سے ماضی کا حسیں منظر نکل آئے

یہ لگتا ہے کہ پتوں پر رکھی تھیں منتظر آنکھیں
مرے آتے ہی کتنے پھول شاخوں پر نکل آئے

مرے ہونٹوں پہ بکھرا یہ تبسم ڈھال ہے میری
کہ جانے کب اُداسی کا کہیں خنجر نکل آئے

گرے ہیں جتنے آنسو دامنِ صحرا میں صدیوں سے
سلگتی ریت بھی اندر سے شاید تر نکل آئے

O

غموں کی آگ پہ سب خال و خد سنوارے گئے
یہ کیسے کرب کے عالم سے ہم گزارے گئے

ہوا ہے اس لئے بھی سوگوار و نوحہ کناں
ہجومِ شہر میں ہم لوگ لا کے مارے گئے

بساطِ وقت پہ کھیلی گئی ہے جب بازی
ہمی تو کھیل میں ہر سمت رکھ کے ہارے گئے

جہاں، جہاں سے بھی گزری ہجومِ ماتم میں
شگفتہ پھول سے چہرے قضاء پہ وارے گئے

وہ چاند ٹوٹ گیا جس سے رات روشن تھی
چمک رہے تھے فلک پر جو، سب ستارے گئے

نگارؔ آگ کہاں اب دھواں بھی مشکل ہے
وہ شب کو اوس پڑی ہے کہ سب شرارے گئے

○

سہمے نحیف دریا کے دھارے کی بات کر
اب دشتِ بے کراں کے کنارے کی بات کر

دنیا کے مسئلوں میں مجھے بھی شریک رکھ
میرے دریدہ دل کے بھی چارے کی بات کر

رہنے دے ذکرِ سود کسی اور وقت پر
راہ وفا میں میرے خسارے کی بات کر

معیار کے نہ مجھ کو کم و بیش میں پرکھ
تجھ کو اگر قبول ہوں سارے کی بات کر

ہم بوریا نشین ترے شاہ بھی تو ہیں
یا لوٹ جا یا ساتھ گزارے کی بات کر

اب آسمان سارا مری دسترس میں ہے
اُنگلی اُٹھا کسی بھی ستارے کی بات کر

محبّت ہے جبھی تو۔۔۔

محبت ہے
جبھی تو کچھ بھی کہتے ہو
تمہاری سرد مہری کے سمندر میں پڑے
چپ چاپ سہتے ہیں
محبت ہے
جبھی تو جب اُڑاتے ہو
پرندوں کی طرح ہم لوٹ آتے ہیں

ہماری خواہشوں کو گھونسلہ رکھنے نہیں دیتی

محبت ہے
جبھی ہم نے تمہاری یاد کا جگنو
حسیں رُوپہلے چہروں کی ضیاء میں
آج تک کھویا نہیں ہے
یہ ذرّے جو چمکتے ہیں
کرن کی اُنگلیاں تھامے
ہمارے خواب ہیں
اور خواہشیں ہیں

محبت ہے
جبھی تو سایا دیتے ہیں تمہیں
جب دُھوپ گہری ہو
فلک سے کہرا اُترے تو
شجر کی طرح ہم کو کاٹ دیتے ہو
ٹھٹھرتی صبحوں میں آخر
تمہارے ہی لیے تو
دُھوپ کی کرنیں پکڑتے ہیں
دریدہ پیلی شاخوں سے
محبت ہے

جبھی تو ہم دیے کی طرح جلتے اور سلگتے ہیں
تمہارے ہجر کی تاریک راتوں میں
ہماری راکھ کو بھی گر ہواؤں میں اُڑاؤ گے
تو واپس لوٹ آئیں گے
ہمیں تو راکھ ہو کر بھی انہی قدموں میں رہنا ہے
محبت ہے جبھی تو۔۔

O

کتابِ عمر سے یوں استفادہ کررہا ہوں میں
زمین و آسماں اپنے کشادہ کر رہا ہوں میں

کرن کے اُجلے دامن ہی سے ساتوں رنگ نکلے ہیں
سُو خود کو روشنی کی طرح سادہ کررہا ہوں میں

فقط اس بات پر مجھ کو نکالا ڈار سے باہر
اُڑانیں اپنی اُونچی اور زیادہ کررہا ہوں میں

لباسِ نیلگوں سجتا نہیں ہے جسم پر میرے
زمیں کو اوڑھ کے اپنا لبادہ کررہا ہوں میں

ابھی رختِ سفر کو باندھ کے رکھا ہے کاندھے پر
ابھی گھر سے نکلنے کا ارادہ کر رہا ہوں میں

O

اندھیرے کو نگلتا جا رہا ہوں
دیا ہوں اور جلتا جا رہا ہوں

مری ہر سمت یہ سائے سے کیوں ہیں
میں جیسے دن ہوں ڈھلتا جا رہا ہوں

دھوئیں سا پھیلتا جاتا ہوں بجھ کر
حدوں سے اب نکلتا جا رہا ہوں

زوالِ آدمیّت دیکھ کر میں
کفِ افسوس ملتا جا رہا ہوں

مجھے تو ٹوٹنا ہے حشر بن کر
نجانے کیوں میں ٹلتا جا رہا ہوں

میں زندہ ہوں کئی صدیوں سے اب تک
فقط چہرے بدلتا جا رہا ہوں

○

قرطاسِ دل پہ اُس کے یوں تحریر ہو کے میں
پھیلا ہوں کتنا لفظ کی تفسیر ہو کے میں

کیا کیا طلسم کھلتے رہے میری ذات پر
تصویر دیکھتا رہا، تصویر ہو کے میں

آوارگی کی قید سے نکلی ہے یوں حیات
آزاد جیسے ہو گیا زنجیر ہو کے میں

جلنے دے مجھ کو اپنی محبت کی آگ میں
پھوٹوں گا نورِ عشق سے تنویر ہو کے میں

صدیوں کے اس سفر میں مجھے دیر تو لگی
آ تو گیا ہوں خواب سے تعبیر ہو کے میں

بنیاد کو تو ایسے ہی مت ٹھوکریں لگا
کیا تجھ کو علم کیا بنوں تعمیر ہو کے میں

میرے سوا بھی میرا ہدف کون تھا نگار
سینے میں اپنے آپ لگا تیر ہو کے میں

لوٹ آنا

سچائیاں اپنے وقت میں
کبھی جی نہیں پاتیں
سو آنکھوں نے ہمیشہ لمحوں سے دھوکے کھائے
تمہیں کیسے رُخصت کروں
کہ بات امام ضامن اور دُعا سے
بہت آگے، بہت آگے ہے
ہتھیلیوں کے گرداب پھسلتے، پھسلتے

بینائی کی دہلیز پہ آبیٹھے ہیں
اُنگلیاں کانوں کو کہاں تک
دستک سے دور رکھیں گی
دُعاؤں کی چھتری میں اکثر سوراخ رہ جاتے ہیں
میں تمہیں کون سی چادر تحفہ دُوں
کہ آج کل جولا ہے
عزت سے زیادہ
کاغذ کمانے کے چکر میں ہیں
میں نے مٹھی کھول کے دیکھی تو سب لکیریں
پتھر سے زیادہ بانجھ نکلیں
میرے پاس سبز موسم نہیں ہے
کہ زرد پتوں کی وسعت نے
خاک سے نیل تک
سرسُوں کا موسم کاشت کر رکھا ہے
میرے پاس کچھ بھی نہیں
بس لوٹ آنا
کہ تمہارے آنے تک
میری آنکھیں
تیرگی کی سلاخوں میں قید رہیں گی

ہوا

ہوا محسوس کرتی ہے
رویّوں اور لہجوں کو
محبت اور نفرت کو
ہوا تو جیتی ہنستی زندگی کا استعارہ ہے
یہی تو موسموں میں سینچ کر پیڑوں کی ہریالی
زمیں شاداب کرتی ہے
یہ بھر کر بیج آنچل میں اُگاتی ہے گھنے جنگل

جو ہم کو سانس دیتے ہیں
ستارے ٹوٹتے ہیں جب خلاء کے کالے دھاگے سے
یہی تو باندھتی ہے
اپنے دامن میں سبھی جلتے ہوئے موتی
فلک کا رنگ اس سے ہے
مگر پھر بھی امیں سربستہ رازوں کی
ازل سے ہے مکیں پتوں کے خیموں میں
اُتر کر جب درختوں سے
گھروں کی سمت آتی ہے
تو اس کی دستکیں سن کر کوئی بھی در نہیں کھلتا
نہ کوئی اس سے کہتا ہے
کہ آؤ چائے رکھتا ہوں
مجھے بھی تم سے سننا ہے
یوں اکثر سرد راتوں میں
کسے تم ڈھونڈتی رہتی ہو
ان ویران رستوں میں
لپٹ کر رات بھر پیڑوں سے
کس کے غم میں روتی ہو

O

آواز دے کے خود کو بلایا نہیں گیا
ایسا گیا ہوں لوٹ کے آیا نہیں گیا

کیسے شفیق پیڑ تھے، کٹنے کے بعد بھی
اُن کا مرے وجود سے سایہ نہیں گیا

بکھرا ہوا ہوں کتنے زمانوں میں ٹوٹ کر
پورا ابھی سمیٹ کے لایا نہیں گیا

سورج کے ساتھ ڈوب گئے غم کی جھیل میں
کس رات تیرا ہجر منایا نہیں گیا

اب بھی سلگ رہا ہے مری روح میں فگار
اک اشک، آج تک جو بہایا نہیں گیا

O

خود پر بھی پوری طرح ابھی کب عیاں ہوں میں
تجھ کو گلا ہے تیری نظر سے نہاں ہوں میں

واقف نہیں ہے میری ابھی تشنگی سے تُو
دریا کو پی کے بحر کی جانب رواں ہوں میں

میں ہی بچھا ہوا ہوں سرِ خاک مجھ کو دیکھ
سر پر تنا ہوا بھی کوئی آسماں ہوں میں

جلتے ہوئے چراغ میں تھا میں ہی روشنی
اُڑتا ہوا ہواؤں میں اب اک دُھواں ہوں میں

کیسے سمیٹ لے گا مجھے بازوؤں میں تو
پھیلا ہوا خلاء میں کراں تا کراں ہوں میں

تکمیل ہو رہا ہوں کسی اور رنگ میں
یہ جو دکھائی دیتا تمہیں رائگاں ہوں میں

O

عذاب اک ہر گھڑی ہے ساتھ اپنے
مسلسل بے گھری ہے ساتھ اپنے

حصارِ تیرگی اپنی جگہ ہے
مگر اک روشنی ہے ساتھ اپنے

دھنک یوں ہی نہیں آنکھوں میں اُتری
اُفق کی دوستی ہے ساتھ اپنے

مجھے ہیں یاد سارے لوگ اب بھی
وہاں کی ہر گلی ہے ساتھ اپنے

اکیلا راکھ میں ہی تو نہیں ہوں
کہ شب بھی تو جلی ہے ساتھ اپنے

یہی تو سوچتا ہوں رک کے اکثر
یہ کس کی زندگی ہے ساتھ اپنے

ہمیں تو راستے میں سب نے چھوڑا
فقط اک شاعری ہے ساتھ اپنے

اے جہلم دریائے جہلم

اے جہلم
دریائے جہلم
تجھ سے بچھڑے میری عمر سے آگے جانے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اے جہلم
دریائے جہلم
میں نے سنا ہے

تیری موجیں ریت سے زیادہ سوکھ گئی ہیں
تیرے بدن کی اک دو زندہ شریانیں جو
تیرے ماضی کی تمثیلیں
تیرے سانسوں کی قندیلیں
اب تک روشن رکھے ہوئے تھیں
اُن میں آ کر شہر کے نالے گرتے ہیں
گاؤں کے بوڑھے پچھلی باتیں سوچتے ہیں تو
اُن کی آنکھیں کھارے آب سے بھر جاتی ہیں
اپنے پوتوں سے کہتے ہیں
اس دریا میں ہر صبح
سورج کو نہاتا دیکھتے تھے ہم
اجلی لہریں
ساحل کی دہلیز پہ ہم کو وضو کرانے آتی تھیں
لیکن اب تو ریت نے جیسے
زندہ دریا مار دیا ہے!!
اور وہ گاؤں میرا گاؤں جس میں موسم
باری، باری خوشبو بانٹنے آتے تھے
کیکر، بیری، ٹاہلی، جامن
اک دوجے کی اُنگلی پکڑے
ساحل تک ہنستے جاتے تھے
ہر سو سبزہ اور سایہ تھا

ہری بھری شاخوں پر چڑیاں، طوطے، مینا
سارے مل کر رہتے تھے
ہر اک بھانت کے پیڑ تھے لیکن
ٹاہلی گاؤں پر قابض تھی
اسی لیے تو ٹاہلیانوالہ نام پڑا تھا گاؤں کا!
کھیتوں میں اور
چار چوفیرے کیکر، ٹاہلی اور شہتوت
ہر دم جھومتے رہتے تھے
لیکن اب وہ اک اک کر کے
غربت اور افلاس کے ہاتھوں کٹ کر سارے
شہتیروں یا راکھ کے ڈھیر میں بدل چکے ہیں
اور وہ کھیت
جن کی پگڈنڈی پر چلتے
سرسوں کی کلیوں کو جب میں
پیار سے چھیڑا کرتا تھا تو
گندم کی ہریالی مجھ کو
آنکھ دبا کر ڈانٹتی تھی
میں ساحر کی نظمیں پڑھتے
پگڈنڈی کے ہاتھ پہ اُگتی
گھاس کو دیکھنے لگتا تھا
اُن کھیتوں کے جسموں پر اب

دہقانوں کی مجبوری نے
بیلچوں اور کسّی کے وار سے
اتنے گھاؤ لگائے ہیں اب
جن کا بھرنا صدیوں تک بھی ناممکن ہے
اور لندن کی بھیڑ میں مجھ کو تنہا چلتے یوں لگتا ہے
بیلچے اور کدالیں مل کر
میرے اندر میلوں گڑھے سے کھود رہے ہیں
ایک خلا سا میری روح میں پھیل رہا ہے
جلے ہوئے پیڑوں کی راکھ
اب دل میں اُڑتی رہتی ہے
اور اکثر دریائے جہلم
بیٹھے، بیٹھے
میری ان سونی آنکھوں سے
یکدم بہنے لگتا ہے

O

چمکے گا کوئی کیسے سرِ خاک ستارہ
ہر بار اُٹھا لیتے ہیں افلاک ستارہ

رہتا ہے مری آنکھ کے دریا میں ہمیشہ
ڈوبا نہیں احساس کا تیراک ستارہ

بخشے گا کوئی لمحہ کبھی مجھ کو بھی کرنیں
چمکے گا کبھی تو مرا ادراک ستارہ

کم ہوتی نہیں تیرگی مٹی کے بدن سے
رکھا ہے کئی بار تہہِ خاک ستارہ

آئندہ صدی اب ہے یہی تیری وراثت
یہ خاک میں لپٹا ہوا نمناک ستارہ

اُٹھے گی نظر اُس کی کبھی کیف میں ڈوبی
چمکے گا کبھی آنکھ میں بے باک ستارہ

روشن تھا کبھی وہ بھی فگار اپنے فلک پر
جو ٹوٹ کے بکھرا ہے سرِ خاک ستارہ

O

شام ڈھلتے ہی ترے دھیان میں آجاتا ہوں
یاد کرتی ہو تو اک آن میں آجاتا ہوں

رات ہے جشن مری روح کی آزادی کا
صبح پھر جسم کے زندان میں آجاتا ہوں

میں نہیں کچھ بھی مگر، تیری نظر پڑتے ہی
کوزہ گر میں کسی امکان میں آجاتا ہوں

تجھ سے لکھے ہیں مرے نقش، سوائے خاک یہاں
آسماں سے اسی احسان میں آجاتا ہوں

دیکھ کر مجھ کو چمکتی ہیں نگاہیں تیری
شکر ہے میں تیری پہچان میں آجاتا ہوں

شام کا ڈوبتا سورج ہے جنازہ دن کا
میں بھی چند اشک لئے لان میں آجاتا ہوں

O

فلک سے اب تو نیا جسم ہی اُچھال کوئی
اُتار لے گیا میرے بدن کی کھال کوئی

بقاء کی جنگ بھی وہ برف کا سمندر ہے
کنارے لگتا نہیں خون کا اُبال کوئی

میں پھول بھیجتا تم کو مگر چمن میں مرے
ہری نہ ہو سکی اب کے برس بھی ڈال کوئی

بہت عروج دیا ہے مری اُداسی کو
اُتار اس پہ تو اب لمحۂ زوال کوئی

خدا تو مجھ سے ہے میں ہی نہیں جو خود میں فگار
رہے پھر اُس سے بھی کیوں رابطہ بحال کوئی

آخری پڑاؤ

شاید میری زمین
اپنے سفر کے آخری پڑاؤ سے بہت آگے نکل چکی ہے
منزل پر جلتے ہوئے فلک بوس الاؤ کی حدت کچھ اتنی تیز ہے
کہ درختوں کی جڑوں سے لے کر
شاخوں کے سروں پہ آنے والا بور تک
پسینے اور گرمی سے ہانپ رہا ہے
وقت کی کٹھالی میں اُبلتے ہوئے حالات کے ساتھ

اب کے کسی عقل مند نے
ہوا کے ہاتھ پہ رکھے ہوئے تمام موسم بھی اُٹھا کے ڈال دیئے ہیں
مجھے یاد ہے
کہ شعور کی پہلی سیڑھی پر پاؤں رکھتے ہی
کسی عصبیتی لمحے نے
میرے کانوں میں یہ سرگوشی کی تھی
کہ "تم تو اپنے باپ کی پیدائش سے بھی بہت پہلے
گروی رکھ دیئے گئے تھے"
بس! میں اُس دن سے لے کر آج تک
بہی کھاتوں کے قرض والے خانے سے نہیں نکل سکا
اور میرے ہاتھوں میں اتنی بے اختیاری بھر دی گئی ہے
کہ میرے گھر کی چابیاں بار، بار پھسلتی ہوئی
میری اُنگلی کی آخری پور پہ آ جاتی ہیں
اور میں دہشت بھری آنکھوں سے خلاء میں دیکھنے لگتا ہوں!
جیسے دورِ غلامی کے سیاہ منظر
آدھے سے زیادہ درسی کتابوں سے باہر نکل آئے ہیں
اب تو یوں لگتا ہے کہ خوف کے لمبے ناخنوں نے
خاک زادوں کے بدن کی مٹی ایسے کھرچ دی ہے
جیسے مکانوں کی دیواروں کا کچا رنگ
تیز بارشوں میں اُتر کر نالیوں میں بہہ جاتا ہے
ہمارے گھروں، محلوں اور سڑکوں پر
نادیدہ دیواریں اتنی اُونچی اُٹھا دی گئی ہیں

کہ ہم سب اکٹھے رہتے ہوئے اور ایک ساتھ چلتے ہوئے بھی
ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتے
اس سال تو
دیکھنے، سننے اور بولنے پر بھی ٹیکس لگا دیا گیا ہے
جیسے ہم سب اپنے، اپنے بدن میں
تنہا کر کے مار دیئے جائیں گے
میں جانتا ہوں
وہ عہد بھی زیادہ دور نہیں
جب ہمیں کوئی نسل
موہنجوداڑو اور ہڑپہ کی طرح دریافت کرے گی
سوچ رہا ہوں کہ ہمیں
کتنے فٹ گہرا کھود کر نکالا جائے گا
اور پھر میوزیم میں رکھی ہوئی شیشے کی الماریوں میں
پرانی ہڈیوں کے نیچے جب یہ تحریر کوئی سیاح رُک کر پڑھے گا
کہ "یہ اُس دور کا انسان تھا
جب ترقی اپنے نقطہء عروج پر تھی
مگر تعلیم یافتہ اُس معاشرے کے لوگ
غاروں اور جنگلوں میں رہنے والے قبیلوں سے
زیادہ بد تہذیب تھے
اور یہ ایک شاعر تھا
جو احساس کی قبر میں
اپنی موت سے بہت پہلے دفن کر دیا گیا!!

خروٹ آباد

(اُس بچے کے نام جو پیدا ہونے سے پہلے مار دیا گیا)

میں
ہزاروں سال کی بھیڑ سے رستہ بناتا ہوا
اس سرائے تک پہنچا تھا
جس سے آگے مجھے
اک اور سفر پر نکلنا تھا
میں تو بس

اپنی آنکھیں، چہرہ اور نامکمل جسم کے
اعضا پورے ہونے کے انتظار میں
ماں کے شفیق وجود کی امان میں تھا!
میرے لئے بس اتنی روشنی کافی تھی
کہ میں بند آنکھوں سے
اپنے ہاتھوں پر اُگتی ہوئی اُنگلیاں دیکھ سکوں
میری ماں اپنے سارے خاندان کے ساتھ
اپنے اجداد کے نہ جانے کون سے ناکردہ گناہ بخشوانے کے لئے
مقدّس زیارتوں کی طرف رواں تھی
کہ اچانک ایک ساتھ
کئی دہکتے ہوئے انگارے
میری ماں کے رحم کی دیواروں میں چھید کرتے ہوئے
میرے قبیلے کے ناکردہ گناہوں کا
کفارہ وصول کرنے کے لئے
میرے گودے جیسے جسم میں اُتر گئے!!
جلتی ہوئی دھوپ میں
لاوارث پڑی ہوئی اپنی ماں کی
قبر جیسی خاموشی سے
میں نے اپنا جرم پوچھا
تو
میرے باپ کے تازہ و ساکت لاشے نے

گرم زمین پر
اپنے جمے ہوئے خون میں
مردہ ہوتی ہوئی آنکھوں کی
تمام نمی اُنڈیل دی

O

ابھی تک بے اماں رکھے ہوئے ہیں
نہ جانے ہم کہاں رکھے ہوئے ہیں

ہمیں رستے میں اُلجھایا گیا ہے
سفر میں ہی نہاں رکھے ہوئے ہیں

ابھی خاموش ہیں کچھ سوچ کر ہم
سو خود کو بے زباں رکھے ہوئے ہیں

رہتی ہے مرے چاروں طرف تیرہ اُداسی
اے شعلہ بدن بھیج شرارہ سی کوئی شام

اس دن کے سمندر میں جو شل ہوتے ہیں بازو
افلاک سے آتی ہے کنارہ سی کوئی شام

ہم روز ہی دفناتے ہیں بجھتا ہوا سورج
پھر ڈھونڈنے جاتے ہیں سہارا سی کوئی شام

O

سفر نشیب سے سوئے فراز ہونے دے
مرا یہ عہد مجھے عہد ساز ہونے دے

زمیں سے مل کے یہی فصلِ نو کو سینچے گا
جو وقت سنگ میں پیدا گداز ہونے دے

مرے خمیر سے اُٹھتی ہے درد کی حدّت
غموں سے جو نہ مجھے بے نیاز ہونے دے

مہکتی رات کو دے کر رہائی جوڑے سے
سمٹتی تیرگی پھر سے دراز ہونے دے

کہو زمین سے ! آتی ہے آنچ ذروں سے
یوں دل کی آگ کا ظاہر نہ راز ہونے دے

ہنسی خوشی سے میں بکھروں گا ٹوٹ کر لیکن
مری شکست کا کوئی جواز ہونے دے

ذرا سی دیر میں جنگل دھمال ڈالے گا
ذرا سا تیز ہواؤں کا ساز ہونے

بڑا ہی خوف آتا ہے

ابھی تو میں نے رنگوں کی
ذرا پہچان سیکھی تھی
ابھی تو منظروں سے پیار کی عادت بنائی تھی
سیہ شب کے گھنے سائے
کسی کے گیسوؤں کے استعاروں میں ہی بدلے تھے
پرندے، پھول، دریا سب نے
اپنی دوستی کا بس اشارہ ہی دیا تھا

یہ ساری کل کی باتیں ہیں
میں چلتا تھا تو کتنی تتلیاں ہمراہ ہوتی تھیں
یہیں سے تو گلوں سے دشمنی آغاز پائی تھی
زمیں جیسے مرے پیروں کے نیچے ہاتھ رکھتی تھی
فلک تو کتنے بادل بھیجتا تھا سایہ کرنے کو

اچانک!
گھر گرا مجھ پر
تو آنکھیں میرے شانوں کی طرح جھکتی گئیں ایسے
کہ سب سے رہ گیا کٹ کر
ضعیفی سوچ میں اُتری
تو چہرے پر اُبھر آئی
مجھے آغاز سے پہلے ہی کیوں انجام کر ڈالا
ملا جو وقت پوچھوں گا
کہ چہرے پر یہ اتنی لائینوں کو کیوں بناتے ہو
جو لکھنا ہے وہ لکھو، صاف لکھو، برملا لکھو
میں چہرے پر پڑی اِن آڑی ترچھی سی لکیروں میں
کبھی جو خود کو تکتا ہوں، تو لگتا ہے
یہ چہرہ جیسے تختی ہے
کہ جس پر وقت بچے کی طرح سے
کبھی تو حرف لکھتا ہے
اگر غصّے میں ہو تو

اپنی تختی کو زمیں پر پھینک دیتا ہے
بڑا ہی خوف آتا ہے
کہ جانے کون لمحہ
مجھ پہ اپنے کس طرح کے حرف تھوپے گا
سیاہی کو انڈیلے گا
میری پہچان بدلے گا
کہ دھرتی پر پٹخ دے گا
کوئی تحریر لکھنے ہی سے پہلے توڑ ڈالے گا
بڑا ہی خوف آتا ہے

خوف

رات کے خیمے میں چھپا ہوا خوف
دن کی شہ ملتے ہی
کرنوں پہ سوار
تمام شہر میں پھیل گیا ہے
گھر کے روزن سے آتی ہوئی نحیف دُھوپ
اور کھڑکیوں کے پردوں میں سہمی ہوئی ہوا
اک دوجے سے گلے مل کر
سرگوشیوں میں رو رہی ہیں

اور میں
دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں کی طرح
خود میں اُلجھا ہوا تھا
میرے پاؤں کے انگوٹھے سے لے کر
سر کے بالوں تک
آتشی سوئیاں چبھ رہی تھی
باہر نکلا تو
ساری گلی دہشت سے بھری ہوئی تھی
اور لوگ چوپایوں کی طرح
اپنے ہاتھوں پہ چل رہے تھے

اس منظر کی لرزتی حیرت نے
میری آنکھیں نکال کر ہتھیلی پہ رکھ دیں
اچانک
عقب سے میرے ہمسائے نے
اپنی کانپتی ہوئی آواز میں
مجھے بھی اُسی عمل کی ترغیب دی
مگر میں کہ ہمیشہ کا سرکش اور ضدی
اُس کی بات سنی اَن سنی کر کے اپنی دُھن میں چلنے لگا
لیکن حیرت کے آتش فشانی دھماکے
مسلسل میرے خون میں جاری تھے

اسی لاوے میں بہتا ہوا
شہر کی مرکزی دیوار کے سامنے پہنچا
جس پہ لکھا تھا
کہ "کل رات احساس نام کا پرندہ
سر دروڈیوں کی بر فیلی گولیوں سے مار دیا گیا ہے"

O

کھو دیے ہیں چاند کتنے اک ستارہ مانگ کر
مطمئن ہوں کس قدر پھر بھی خسارہ مانگ کر

موج کے ہمراہ تھا تو سارا دریا ساتھ تھا
ہو گیا غرقاب لہروں سے کنارا مانگ کر

راکھ میں اب ڈھونڈتا ہوں میں درو دیوار کو
گھر دیا ہے آگ کو میں نے شرارہ مانگ کر

اس شہر میں ہو جاتے سبھی سرد روّیے
ہم تیز اگر خون کی رفتار نہ رکھتے

ہم اہلِ نظر، اہلِ قلم، اہلِ محبت
کیا ہوتا اگر دیدۂ بیدار نہ رکھتے

O

آج بھی روحیں بھٹک رہی ہیں کھیتوں میں کھلیانوں میں
گاؤں سے جو بس گئے آ کر شہروں کے ویرانوں میں

لہجے ہیں یا نرخ آویزاں کاروباری چہروں پر
اُونچی نسبت والے بھی تبدیل ہوئے دکانوں میں

میرے اندر سناٹا ہے صدیوں کی تنہائی کا
وقت کی چیخیں گونج رہی ہیں میرے دونوں کانوں میں

میری ذات میں دیواروں کا جنگل بونے والو کہو
آدم کو تقسیم کرو گے تم اب کتنے خانوں میں

اُس نے سارے نوچ دیے ہیں اپنے سرد رویوں سے
میں نے کیا کیا پھول رکھے تھے آنکھوں کے گلدانوں میں

O

آنکھ میں خواب ڈبوئے میں نے
دکھ اپنے خود ڈھوئے میں نے

کیا کیا قبریں ہیں سینے میں
کیا کیا آنسو روئے میں نے

رات کٹی اور تکتے، تکتے
چاند ستارے کھوئے میں نے

دل کی گہری خاموشی میں
چپ کے موسم بوئے میں نے

خود پر اور کھلا ہوں میں تو
جب بھی درد بلوئے میں نے

ریت کے ہر ذرّے میں دریا
دیکھ لیے ہیں سوئے میں نے

جان کی نازک سی ڈوری میں
کتنے سال پروئے میں نے

اُس کی باتوں کی بارش میں
ساون کئی بھگوئے میں نے

دریائے جہلم کے نام

اب ریت کی چادر بھی ہٹاتا نہیں دریا
کچھ روز سے ہم کو نظر آتا نہیں دریا

سب لوگ کناروں پہ پڑے ہانپ رہے ہیں
لہروں میں تری کوئی دلاسہ نہیں دریا

کس درد کی دیمک نے تجھے ریت کیا ہے
تو نے تو کوئی بھید بھی کھولا نہیں دریا

کھیتوں کے دھانوں پہ بڑی پیاس جمی ہے
یاروں سے تو ایسے کوئی کرتا نہیں دریا

ہم کو تھا گماں اپنے قبیلے سے ہے تو بھی
تو نے مگر اپنا ہمیں سمجھا نہیں دریا

کچھ بول کہ سننے کو میں بے تاب کھڑا ہوں
کیا بیت گئی کچھ بھی بتاتا نہیں دریا

بنجر سا ہوا جاتا ہوں کچھ روز سے میں بھی
آنکھوں سے مری ان دنوں بہتا نہیں دریا

زمیں زادو

زمیں زادو
جنونِ حاکمیت خود پسندی کا یہ لاوا
کیوں اُبلتا اور بہتا جا رہا ہے
ساری دھرتی پر
کہاں سے حکم آتا ہے
یہ کیسی سوچ کے پیرائے میں تم ڈھالے جاتے ہو
کہ نفرت اور گہری ہو رہی ہے

زمیں زادو
بدن دھرتی میں بونے سے فقط قبریں ہی اُگتی ہیں
لہو یوں ہی اگر بہتا رہا
مہر و وفا، احساس کے
سب بہتے دریا سوکھ جائیں گے
زمیں زادو
یہ کیسے خوف کے اندھے کنوئیں میں قید ہیں سارے
کہ اک دوجے سے بچنے کے لئے
ہم بم بناتے ہیں
اور اک دوجے پہ شب کی تیرگی میں وار کرتے ہیں
زمیں زادو
زمیں تقسیم کر کے سرحدیں کس نے بنائی ہیں
وہ دن بھی آنے والا ہے
پرندوں کے لئے بھی
جب کوئی قانون آئے گا
سپاہی فاختاؤں کے پروں کو بھی ٹٹولیں گے
پرندے دل میں سوچیں گے
ہمیں انساں نے کیوں اپنی صفوں میں کر لیا شامل
یہ کس نے حق دیا اِس کو
ہمیں اپنی طرح سمجھے
ہمیں اپنی طرح سوچے

زمیں زادو
خلاء کا زخم بڑھتا جا رہا ہے
پہاڑوں کی سفیدی بھی پگھل کر
اب ندی کی آنکھ سے بہنے لگی ہے
سبھی منظر دُھوئیں میں قید ہوتے جا رہے ہیں
زمیں زادو
گلوں سے تتلیاں
اور تتلیوں سے باغ مت چھینو
کہ اب تو شرم آتی ہے
مری پہچان ہونے پر
مجھے انسان ہونے پر

وعدہ

یہی کہا تھا نا رات تم نے
تمہاری آنکھوں میں آنسوؤں سے بھری گھٹائیں
کہیں سے آ کر ٹھہر گئی ہیں
یہ سن کے میرے تو دن کے پاؤں پھسل گئے ہیں
وہ گر کے ٹوٹا تو کرچیوں سے
لہو بہاتی حسین سوچیں
مشامِ جاں میں کراہتی ہیں

میں حوصلوں کی قبا میں اپنے
تمام گھاؤ چھپا کے جاناں
تمہارے خوابوں کی سیڑھیوں سے
یوں زینہ زینہ اُتر رہا ہوں
اُداس ہونٹوں پہ مسکراہٹ کے گل سجاؤ، دیئے جلاؤ
چلو مٹاؤ، یہ اپنی آنکھوں کی تیرگی کو
ملالِ جاں سے نکل کے آؤ
تمہاری خاطر
میں اپنی ساری وفائیں لے کر
تمہارے جیون میں آ گیا ہوں
یہ میرا وعدہ ہے آج تم سے
کہ وسوسوں کی سیاہ بارش کے خوف قطرے
تمہارا آنچل نہ اب کبھی بھی بھگو سکیں گے

○

دن بھر کی مسافت سے یہ ہارا ہوا سورج
کیا دے گا مری آنکھ کو بجھتا ہوا سورج

بانٹوں گا میں بستی میں بھی کرنیں، ذرا پہلے
کھیتوں میں مرے اُگنے دو بویا ہوا سورج

حلقہ سا کیے رہتی ہیں اطراف میں کرنیں
ڈھلتا نہیں سوچوں کا تراشا ہوا سورج

ہر رات کے روزن سے یہی سوچ کے جھانکا
شاید کہ پلٹ آئے وہ بھولا ہوا سورج

صحرا کے چمکتے ہوئے ذرّوں میں ہر اک سو
دیکھا ہے پڑا ٹوٹ کے بکھرا ہوا سورج

O

یوں گل ہوئے نجومِ درخشاں زمین پر
اب بس رہے ہیں شہرِ خموشاں زمین پر

ہے اب سکون سے تہی سیارۂ بشر
انسان امن سے ہیں گریزاں زمین پر

معمورۂ سفال میں بھونچال سا ہے کیوں
ہونے کو ہے بپا کوئی طوفاں زمین پر

اے شہپرِ خیال اک ایسی اُڑان بھر
ہر شخص ہو زبانِ بدنداں زمین پر

میں تو بقائے آدمی پر سوچتا ہوں دوست
زندہ بچے گا کیا کوئی انساں زمین پر

وہ دیکھ ٹہنیوں پہ نمو پا رہے ہیں خوف
کتنے ہی حادثات ہیں خنداں زمین پر

میں تو فگارؔ دیکھ رہا ہوں کہ چار سو
پھر بڑھ رہے ہیں دشت و بیاباں زمین پر

O

بہت تقسیم ہونی ہے، بہت تفریق ہونی ہے
ابھی تو وقت کے ہاتھوں مری تصدیق ہونی ہے

مری طاقت ابھی تو اور بڑھنی ہے مرے دشمن
مری آواز عصرِ نو کی اک تحریک ہونی ہے

اثاثہ ہوں میں اپنی آنے والی کتنی صدیوں کا
خبر کیا تم کو مجھ پر کس قدر تحقیق ہونی ہے

مجھے پھر سے پلٹنا ہے نئے سانچے میں ڈھلنا ہے
مجھے آنا ہے میری پھر نئی تخلیق ہونی ہے

اُسے کھو کر کوئی منظر کہاں آنکھوں میں آئے گا
سحر میری شبِ تیرہ سی اب تاریک ہونی ہے

جان محمد

(ساقی فاروقی صاحب کے نام)

جان محمد
ہرے لان کی دھوپ میں کھوئی
ایک لہر کے دکھ میں اب تک
زندہ سچا پانی جانے
کتنی کرنوں کی مٹھی کو
کھول کے خود کو ڈھونڈ چکا ہے

اک کونے میں
خالی بورے سے دو آنکھیں
اپنے اندر بدرِ منیر کی روشن صدیاں
بھر کر گھر کو دیکھ رہی ہیں
جان محمد
باتھ روم کی چھت سے اب بھی
ٹب میں جانے
کتنے ٹکڑے نظمیں لے کر اُتر رہے ہیں
ایک لہر کو ڈھونڈنے میں تم
جلتے، تپتے صحراؤں کے
چمکیلے ذروں میں اترے
اور پھر ان سے باہر آنا بھول گئے ہو
سو وہ اب بھی روشن ہیں
جان محمد
پام کے پیڑ سے جتنی باتیں تم نے کی تھیں
اب وہ ساری شاخ، شاخ پر پتہ، پتہ اُگ آئی ہیں
اِن سب لفظوں کی ہریالی
کتنی تازہ اور گھنی ہے
شعر و سخن کے گہرے دریا!!
ہم بھی اِن زرخیز کناروں کی پوروں سے
علم و عقل کے موتی چن کر

جہل کی اندھی تاریکی کو
آنکھیں دینا چاہتے ہیں
اور تمہارے گھر کے باہر
کتنے چوہے
بلوں کی رسی کو پکڑے
دروازں کو دیکھ رہے ہیں

○

مجھے نہ دیکھ تو یوں سیم و زر کے ہالے سے
مجھے تو جانچ میری فکر کے حوالے سے

شبوں نے کی ہے سدا پرورش سویروں کی
سحر کی روشنی ہے رات کے جوالے سے

پیام بھیج رہا ہے ہوا کے ہاتھ کوئی
اُتر رہے ہیں میرے چار سو اجالے سے

یہ آسمان کے چہرے پہ سرخیوں کا ہجوم
رواں دواں ہے مرے خون کے اُچھالے سے

مجھے تو روشنی کی بھیک دینے آیا ہے
چمک رہا ہے زمانہ مرے اُجالے سے

O

بادلوں کی آنکھ کا یہ ایک قطرہ دیکھنا
کس طرح بہتا ہے بن کر موجِ دریا دیکھنا

جانتا ہوں کون آکر پھول رکھے گا یہاں
پھر بھی عادت ہوگئی خالی دریچہ دیکھنا

جگنوؤں کے قافلے چلتے ہیں شب بھر ریت پر
چاندنی راتوں میں تم اک بار صحرا دیکھنا

پوچھتے ہو کیسا لگتا ہے سمندر پیاس میں
تم کو فرصت ہو تو آ کر میرا چہرہ دیکھنا

پہلے مٹی کھیت کی بیچی گئی تھی اب فگار
بھوک کی کلہاڑیوں سے پیڑ کٹتا دیکھنا

O

بدلے ہوئے حالات کا دکھ ہے
اک انجانی بات کا دکھ ہے

جانے کل کو کیا ہو جائے
دل میں کچھ خدشات کا دکھ ہے

ارضِ پاک لہو میں ڈوبے
تیرے ہر دن رات کا دکھ ہے

یہ جو عکس ہے دُھندلا دُھندلا
میری آدھی ذات کا دکھ ہے

جانے بادل کی آنکھوں میں
کس سوکھی برسات کا دکھ ہے

O

دیکھیے کس سمت جاتا ہے کنارہ چھوڑ کر
اب کے دریا بہہ رہا ہے اپنا دھارا چھوڑ کر

میرے جذبوں کے سبھی موسم ہیں اپنی خاک سے
مجھ کو جانا ہے کہاں پر یہ ستارہ چھوڑ کر

تو یہ سمجھا تھا نگل جائیں گی یہ پسپائیاں
تو گیا مجھ کو شکستہ اور ہارا چھوڑ کر

جاوداں کر یا بہا دریا میں اے میرے جنوں
آ گیا ہوں میں خرد کا ہر سہارا چھوڑ کر

دل نوازی کا کوئی لمحہ مرے اے کم سخن
جھانک میری آنکھ میں، آ ہر نظارہ چھوڑ کر

جنبشِ ابرو سے تیری ہیں مرے شام و سحر
زیست کیا ہے تیری آنکھوں کا اشارہ چھوڑ کر

ہو کے عالم میں یہ سناٹے کی سرگوشی فگارؔ
آ بسی دل میں اُداسی دشت سارا چھوڑ

O

غموں کی آبیاری ہو رہی ہے
مسلسل اشکباری ہو رہی ہے

دسمبر راہ میں ہے اور دل پر
ابھی سے برفباری ہو رہی ہے

میں دھنستا جا رہا ہوں اور نیچے
سے کی سنگباری ہو رہی ہے

نکھرتا جا رہا ہے حسن اس کا
وہ صورت اور پیاری ہو رہی ہے

کثافت بڑھ گئی ماحول میں اب
ہوا بھی کتنی بھاری ہو رہی ہے

اپنی ماں کے لئے ایک نظم

یہ اک دو دن کی بات نہیں
اب کتنے سال ہی بیتیں گے
لمحوں کی گنتی بے معنی
ہفتوں کا حساب بھی بے معنی
اب وقت کے بوڑھے برگد سے
ٹوٹیں گے، گریں گے، بکھریں گے
پتوں کی صورت ماہ وسال

یہ پتے میرے خوابوں سے
یہ پتے میری جوانی سے
یہ پتے میرے یاروں سے
یہ پتے میرے پیاروں سے
شب گہری ہوتی جاتی ہے
دہلیز پہ رکھی آنکھوں کو
لے جاؤ اپنے کمرے میں
اور سو جاؤ
میں جانے واپس کب لوٹوں
ابھی کتنے کام اُدھورے ہیں

O

زمین کاٹ دی اور آسمان پھینک دیا
یہ کن خلاؤں میں میرا جہان پھینک دیا

کرن کے تیر کریں گے لہو لہان بدن
ہری رتوں کا اگر سائبان پھینک دیا

کنارِ عزم و یقیں ہوں کھڑا تسلی سے
اُٹھا کے ذہن سے ہر اک گمان پھینک دیا

گلے سے کھینچ کے آواز لفظ مار دیئے
سکوتِ شب میں مجھے بے زبان پھینک دیا

مجھے نکال کے میرے بدن کی سرحد سے
اجل نے مجھ کو کہاں بے امان پھینک دیا

O

دشتِ آب کے آہو دیکھ
میری آنکھ کے آنسو دیکھ

میں ہوں اب بے نور ستارہ
بجھ گئے روشن پہلو دیکھ

وقت حیات کا مول لگائے
ہر لمحہ ہے ساہو دیکھ

ٹوٹی شاخ پہ رونے والے
میرے کٹے ہوئے بازو دیکھ

سب نے درد کی فصلیں کاٹیں
میاں محمد، باہو دیکھ

O

اب کے صدی گرانی کی ہے
رشتوں میں ارزانی کی ہے

خط میں اس کو کیا لکھنا تھا
دل کی بات زبانی کی ہے

وقت نے مجھ کو اوڑھا برتا
میری شکل پرانی کی ہے

کس نے میرا بچپن کھیلا
کس نے بسر جوانی کی ہے

تم آئے تو تنہائی نے
دل سے نقل مکانی کی ہے

تم نے آکر رنگ بھرا ہے
میری شام سہانی کی ہے

اوس نہیں یہ رات زمیں پر
چاند نے اشک فشانی کی ہے

کس نے بانجھ کیا کھیتوں کو
گلیوں میں ویرانی کی ہے

شاہِ وقت نے ملک میں ہر سو
مرنے میں آسانی کی ہے

تذبذب

آدھا دن تو بیت گیا ہے
آنکھیں ملتے
اپنے صحن کے اندر چلتے
گھر سے باہر آتے آتے
دوپہر کا جلتا سورج
اپنی کرنوں کے ریوڑ کو
واپس خود میں ہانک رہا تھا

دروازے پہ رک کر میں نے
دل ہی دل میں

سارے کاموں کو دہرایا
میری لسٹ تو آنے والے دن سے بڑی تھی
اور ازل سے طے ہے یہ بس
عمر کی اس گھڑی میں ہمیشہ
اک دن رکھا جاتا ہے
سوچ رہا ہوں
شامِ شفق کو میری جیت کا
ہار بنا کر اُترے گی
یا پھر رات کا اندھا کنواں
مجھ کو سالم نگلے گا

آئینِ وفاداری

سنا ہے!
رہبرانِ قوم پھر سے لوٹ آئے ہیں
خبر اُن کو ملی ہوگی
ابھی یہ لوگ زندہ ہیں
اور ان کے جسم میں
اب بھی ذرا سا خون باقی ہے
اگر اِن بجھتی آنکھوں میں

نئے خوابوں کی قندیلوں کو روشن کردیا جائے
تو سب کچھ بھول جاتے ہیں!
انھیں معلوم ہے
یہ گھاس کی صورت سبھی رستوں میں اُگتے ہیں
اگر کچھ لاکھ ان میں سے جلا کر اپنے محلوں میں
کبھی ہم روشنی کرلیں
تو کیا احسان کرتے ہیں
یہ ان کا فرض ہے
ہم رہبروں کی شان و شوکت کو
خراجِ زندگی دے کر
وفا کی زرد شاخوں کو
دوبارہ تازگی بخشیں

گدھ

زمیں پر نیم مُردہ قوم کا ---
پھر جسم رکھا ہے
وطن کے چاروں کونوں اور
باہر کی دُنیا سے
ہزاروں کرگسوں کے نائب آپس میں
صلاح و مشورہ کرنے کو آئے ہیں
حقوق و فرض کے تازہ کبابوں کو

بطورِ خاص مہماں کی تواضع کے لئے رکھا گیا ہے
بڑا ہی خاص نکتہ ہے
کہ مل کر طے یہ کرنا ہے
دریدہ، زخم خوردہ جسم کو اب کون نوچے گا
نگار اب کس کی باری ہے
درختوں کی گھنی شاخوں پہ پتوں سے زیادہ
ہر طرف ہی اک ہجومِ کرگساں بیٹھا ہوا ہے
اور اُن کی بھوکی آنکھوں
گندی چونچوں سے ٹپکتی رال کی بیہودہ بدبو سے
فضا میں اک تعفن ہے
اشارے میں
ابھی کچھ دیر باقی
اشارہ ملتے ہی
اِن سب نے ہم پر ٹوٹ پڑنا ہے

O

اپنے غم کو اپنی آنکھوں میں بلونا چاہئے
شہرِ تنہا میں لپٹ کر خود سے رونا چاہئے

جم گئی ہیں بے حسی کی کالکیں احساس پر
آنسوؤں کے آب سے ہر دل کو دھونا چاہئے

لمحہ لمحہ آنکھ میں اک خواب مرتا ہے مرا
کب تلک چھپ چھپ کے پلکوں کو بھگونا چاہئے

وقت اک بگڑا ہوا بچہ ہو جیسے شاہ کا
ہر گھڑی ہی اک نیا جس کو کھلونا چاہیے

کیسا موسم ہے کہ قبریں اُگ رہی ہیں چار سو
خاک کو اتنا نہیں زرخیز ہونا چاہیے

O

ہمارا راستہ تو منزلوں سے دور جاتا ہے
نجانے کیا سمجھ کر تو سفر پر ساتھ نکلا ہے

ہماری آنکھ میں اب خواب کی بس دھول باقی ہے
پسِ جاں شام ڈھلتے ہی کوئی ماتم سا ہوتا ہے

ستارہ ہوں مگر اب بجھ گئی ہے روشنی میری
سو اب تو دور تک مجھ میں اندھیرا ہی اندھیرا ہے

میں بستی سے چلا تھا تو کسی نے بھی نہیں روکا
مجھے صحرا سے جانے کون اب آواز دیتا ہے

چھنا سایہ بدن کا تو یہ میں نے دیر تک سوچا
کہ شہرِ ناشناساں میں بھلا اب کون میرا ہے

اندھیرا درحقیقت روشنی کا خون ہے لوگو!
جہاں بھی قتل ہو سورج وہاں پر پھیل جاتا ہے

○

پہلے ہی سے جاری ہے یہاں خاک کا ماتم
اُس پر ہمیں کرنا پڑا افلاک کا ماتم

آنکھوں کے سلگنے کا کسے دکھ ہے یہاں پر
کس دل نے کیا دیدۂ نمناک کا ماتم

دستار تھی مٹی پہ تو سر بھی تھا وہیں پر
لوگوں نے کیا طرۂ پیچاک کا ماتم

یہ بخیہ گری نعمتِ احساس ہے یارو
اعزاز ہے میرے لیے ادراک کا ماتم

اوڑھا ہے بدن اُس کا تو بستی میں یہ ہر سو
کیوں ہونے لگا ہے مری پوشاک کا ماتم

شب بھر ہی رہی اندھی ہوا سر کو پٹختی
کرتی ہی رہی سینۂ صد چاک کا ماتم

موجوں نے بھی دریا کی ہتھیلی سے نکل کر
کس رنج و الم سے کیا تیراک کا ماتم

○

تم سے بھی جڑا سلسلہ کیا اور طرح کا
یہ سوچ کا رشتہ ہے ذرا اور طرح کا

یہ گھاؤ مرے دل پہ کوئی پہلا نہیں ہے
اک تیر مگر اب کے لگا اور طرح کا

سب لوگ ہیں شکووں سے بھرے تھال اُٹھائے
مجھ کو ہے مگر تم سے گلہ اور طرح کا

اس برف کے موسم میں بھی کیا آگ چھپی ہے
میں ٹھنڈی ہواؤں میں جلا اور طرح کا

شب ڈھلتے ہی اک نور سا چل پڑتا ہے آگے
روشن ہے کوئی مجھ میں دیا اور طرح کا

بچھڑے ہیں کئی لوگ مگر اب کے برس تو
اک شخص ہوا مجھ سے جدا اور طرح کا

O

تمہارا پیار مجھے جب سے ہے سنبھالے ہوئے
وفا کے نور سے ہیں روز و شب اُجالے ہوئے

اُٹھا کے پھرتے رہے ہیں عذابِ دربدری
کبھی بہشت کبھی ذات سے نکالے ہوئے

لہو کی آنچ سے پگھلایا میں نے لفظوں کو
خیال ایسے نہیں شاعری میں ڈھالے ہوئے

جلا کے راکھ کیا اور یوں ہی چھوڑ دیا
پھر اس کے بعد ہواؤں کے ہم حوالے ہوئے

اُتر کے دل میں تمہارے یقین آیا ہے
تمہاری سمت ازل سے تھے ہم اُچھالے ہوئے

O

قدم قدم پر غم رکھے ہیں
اب تو رستے بھی روتے ہیں

جھکے ہوئے شانوں کو دیکھو
ان پر خوابوں کے لاشے ہیں

نیلے شہر میں رہنے والے
اکثر ملنے کو آتے ہیں

آنکھ سے پانی اُبل رہا ہے
سینے میں کتنے چشمے ہیں

اس بستی میں رہنے والے
گونگے، بہرے اور اندھے ہیں

تیرا صبر بھی ڈوب نہ جائے
غم کے بحر بڑے گہرے ہیں

دھیرے دھیرے ان ذہنوں میں
کتنے جنگل اُگ آتے ہیں

روح میں ٹھنڈک سی رہتی ہے
پیڑ یقیں کے سبز ہوئے ہیں

آنکھیں موندیں تاریکی میں
کتنے اپنے لوگ ملے ہیں

گہری آنکھ سے دل میں جھانکو
سارے پردے اُٹھ جاتے ہیں

خوشیاں بانٹ لیں دنیا والے
غم نہیں دوں گا، یہ میرے ہیں

O

بشر سے ہو کے بہت بدگمان چھوڑ دیا
خلوص و مہر و وفا نے جہان چھوڑ دیا

بڑے ہی پیار سے مجھ کو بلا رہی تھی زمیں
کچھ ایسا درد اُٹھا آسمان چھوڑ دیا

لگے گی زیست کی ناؤ نہ جانے کس ساحل
ہوا کے رخ پہ کھلا بادبان چھوڑ دیا

یہ جسم رکھ کے اسی خاک کے بچھونے پر
طلوعِ صبح یہ خستہ مکان چھوڑ دیا

پگھلنا چاہتی تھی برف میری سوچوں کی
سو میں نے دھوپ میں ہر سائبان چھوڑ دیا

زبانِ خلق پہ رہتے ہیں تذکرے میرے
بنا کے اُس نے مجھے داستان چھوڑ دیا

عمرِ رواں

پچھتاوے کی دھول جھٹک کر
جب غفلت کی اُونگھ سے نکلا
تو یاد آیا
پچھلے لمحے دروازے سے دن باندھا تھا
لیکن اب تو
پیر کی جانب دھندلی دھندلی تاریکی ہے
اور سرہانے چاند دھرا ہے

میں یہ منظر
خاموشی سے دیکھ رہا ہوں
کیسے اک، اک کر کے ساری
برفیلی رُوپہلی کرنیں قطرہ قطرہ
پگھل رہی ہیں
سر سے تن پر اُتر رہی ہیں
دن کے ٹکڑے تارا، تارا
رات کی چادر پر بکھرے ہیں

جلاوطن

(اقبال کوثر صاحب کی یاد میں)

اور۔۔۔حالات کی اس چکی کے دو پاٹوں میں
پستے، پستے
میرے صبر کی کتنی گندم
اپنی صورت بدل چکی ہے
لیکن وقت کا خالی پیٹ
اپنی بھوک آنکھوں میں رکھ کر
ہر دن سورج کے اُگتے ہی

میرے گھر میں آ جاتا ہے
اس کی بھوک اور میرے دن میں بنتی قبریں
ہر دن بڑھتی جاتی ہیں
آنکھیں موندتا ہوں تو یک دم
سرسوں کی پاگل خوشبو
شنیل، باس☆ کی لہریں روند کے
میری روح پہ بگل مار کے
پیلی اور ہریالی باتیں
کیا کچھ کان میں کہہ جاتی ہیں
کچھ باتیں تو میرا کلیجہ اپنی دھار سے
بوٹی بوٹی کر جاتی ہیں
کتنے پیڑ اور کتنے چہرے
اب کے برس سرسوں کی پیلی کلیوں نے
کتبوں کی مٹی کے نیچے
ابدی نیند میں دیکھے ہیں
آنسو، آنسو سوچ رہا ہوں
یورپ کے مصروف شہر میں
وہ موسم کب آئے گا
جب میری بریدہ ٹانگوں سے
پاؤں کی کونپل پھوٹے گی اور
گاؤں قبریں بننے سے پہلے
میں زندوں میں جاؤں گا

☆Boss(باس)، Chanel(شنیل) پرفیومز کے نام

سوال

عزت کو روٹی کی شکل میں کیوں دیکھا جاتا ہے
کیا یہ گول ہوتی ہے
اٹھنی اور چونی کی محدود گولائی
پھیل کر پوری دنیا پر
کیوں حاوی ہو جاتی ہے
کیا انسانیت کا کوئی مذہب
اور نسل ہوا کرتی ہے

لہو کا رنگ سُرخ
اور ماں کا دودھ سفید ہی کیوں ہوتا ہے
اگر لا سکتے ہو تو
اپنے الگ ہونے کا ثبوت لاؤ
میں تمہارا قانون
اپنی نسلوں پہ واجب کر جاؤں گا

○

بچھڑ کے تجھ سے ابھی تک یہ واہمہ ہے مجھے
ہر ایک شخص سے بڑھ کر تو چاہتا ہے مجھے

فلک پہ کس کو طلب ہے کہ اس خرابے میں
جلا کے دیپ کوئی روز ڈھونڈتا ہے مجھے

یہ کیسا وقت کا دریا ہے لمحہ، لمحہ کوئی
مجھے خبر بھی نہیں اور بہا رہا ہے مجھے

ستارے ہیں کہ یہ نگران مجھ پہ آنکھیں ہیں
اُفق کے پار کوئی ہے جو دیکھتا ہے مجھے

ہزار قرنوں سے جاری یہ سلسلہ ہے فگاؔر
میں لوٹتا ہوں تو وہ پھر سے بھیجتا ہے مجھے

O

بہتے ہوئے رستوں کے بھنور سے نہیں نکلے
اک راہِ مسلسل کے اثر سے نہیں نکلے

چشمے کی طرح پھوٹی تھی جب موت زمیں سے
ہم آج بھی اس لمحے کے ڈر سے نہیں نکلے

ویرانیِ اشجار و چمن اور بھی کچھ ہے
کیوں رنگِ خزاں برگ و ثمر سے نہیں نکلے

لگتا ہے ابھی سارا سفر باقی پڑا ہے
ہم جیسے ابھی اپنے ہی گھر سے نہیں نکلے

دنیا نے کیا چاند ستاروں کو مسخر
ہم لوگ نگار اپنے کھنڈر سے نہیں نکلے

O

میری آنکھ سوالی کر کے
شہر گیا وہ خالی کر کے

میرے حصے خار ہی آئے
پھولوں کی رکھوالی کر کے

بولو تم نے کیا پایا ہے
جذبوں کی پامالی کر کے

دوشِ ہوا پر اُڑ گئے پنچھی
سُونی پیڑ کی ڈالی کر کے

آخر چاند بھی ڈوب گیا ہے
رات کو اور بھی کالی کر کے

کتنے ہیں آسودہ سارے
گھر کی خستہ حالی کر کے

اس کو سب کچھ دے آئے ہیں
اُلٹی ہاتھ کی تھالی کر کے

رکھ لے پاس محبت میری
اپنے کان کی بالی کر کے

حاکمیت

مالی نے جب سے
کنوئیں کی دوسری جانب
پیپل کا نوخیز پودا لگایا ہے
تناور، عمر رسیدہ پیڑ
اُس دن سے، بہت ناراض ہے
شاخوں پہ بیٹھے ہوئے پرندوں نے
آپس میں سرگوشی کی

کہ آج تو مہاراج کے چہرے کی جھریاں
غصے میں اور بھی نمایاں نظر آتی ہیں
اک اور پرندے نے
اپنے دوستوں کو چہچاتے ہوئے بتایا
کہ آج صبح میرے سامنے بوڑھے برگد نے
اپنی جڑوں تک کی
تمام گندگی سمیٹ کر
مالی کو اپنے پتوں جتنی گالیاں دی ہیں!!

بنتِ حوا

میں تم سے صرف ایک بار جنمی گئی ہوں
مگر تم تو آج تک
مجھ سے جنم لے رہے ہو
پھر میں محض اک سایہ بن کر کیوں رہ گئی
وجود کیوں نہیں بنی
میرا پڑاؤ ہمیشہ
تمہارے انگوٹھے کے نیچے کیوں رکھا گیا ہے

میں تمہارے نام کی سِل اپنے بدن سے ہٹا کر
کھلی ہوا میں منہ بھر کر سانس لینا چاہتی ہوں

باپ
بھائی
شوہر
اور بیٹے کے گھر کے علاوہ
میرے پاؤں کے نیچے میری اپنی زمین بھی تو ہونی چاہیئے
قیدی آنکھوں میں التجا کے پھول لئے
اجازتوں کی راہ تکتے، تکتے پنکھڑیاں سوکھ کر
میری روح میں کانٹوں کی طرح چبھنے لگی ہیں
خدا کے لئے
میری آنکھوں کو زمین کے ساتھ اتنا کس کے مت باندھو
کہ میں آسمان کے رنگ دیکھنا چاہتی ہوں
اور تمہاری آنکھوں میں سلگتی ہوئی اندھی انا کی چنگاریوں کو
اپنی رُو پہلی محبت کی پھوار سے سرد کرنا چاہتی ہوں
پیروں سے اُٹھ کر میرے دل میں
تمہارے ساتھ چلنے کی خواہش ہے
اور تم مجھے کئی رشتوں کی طنابوں میں جکڑ کر بھی
میری اُڑان سے خوفزدہ ہو
یہ جان کر بھی
کہ اگر پرندوں کے پر کاٹ دیئے جائیں

تو پھر اُن کے لئے
پنجروں کی ضرورت باقی نہیں رہتی
منتوں کا ورد کرتے کرتے
میری زبان کا گوشت گلنے لگا ہے
چلو حکم نہ سہی کم از کم
مجھے اپنی بات کرنے کی تو آزادی ہو
جانتے ہو
تمہاری کہنہ روایات کی بیڑیاں
پنڈلیوں کا گوشت کاٹ کر
اب میری ہڈیاں بھی چبانا چاہتی ہیں
میں منہ کے بل گری یا معذور ہوئی تو
احتجاجاً
بانجھ ہو جاؤں گی
اور اگر میں بانجھ ہوئی
تو پھر اپنے جنم کے لئے
آئندہ صدی
تم کس کی کوکھ سے جنمو گے

ملا ہے مجھ کو پڑاؤ سفر بناتا ہوا
میں چل رہا ہوں نئی رہ گزر بناتا ہوا

ازل سے ڈھونڈ رہا ہوں میں اپنی ہستی کو
بنائے حرف و ہنر کو نظر بناتا ہوا

نہ پوچھ کیا ہے پسِ گردِ کاروانِ حیات
گزر گیا ہے مجھے اک خبر بناتا ہوا

یہ تیرا ہجر کہ جیسے سلاخ پگھلی ہوئی
عزیز تر ہے مجھے بے بصر بناتا ہوا

نہ پوچھ مجھ سے بسے گھر کی رونقیں کیا ہیں
کہ میں تو رہ گیا باہر ہی در بناتا ہوا

یہ کیا طلسم کہ صحرا کی جلتی ریتوں میں
فگارؔ ڈوب گیا ہوں بھنور بناتا ہوا

O

ہر قدم آگہی کی سمت گیا
میں سدا روشنی کی سمت گیا

لفظ لے کر خیال کی وسعت
شعر میں تازگی کی سمت گیا

میں جو اُترا لحد کے زینے سے
اک نئی زندگی کی سمت گیا

تشنگی کو میں اپنے ساتھ لیے
دشتِ آوارگی کی سمت گیا

کچے رنگوں کی اس نمائش سے
میں اُٹھا سادگی کی سمت گیا

نطق پھر تازگی کی خواہش میں
گوشۂ خامشی کی سمت گیا

O

ہم اَوجِ ثریا پہ بھی اس حال میں اُترے
جس طرح کوئی پنچھی کسی جال میں اُترے

اُس زہر کا کیا ہو جو میری خاک سے مل کر
ہر پھول میں، ہر پات میں، ہر ڈال میں اُترے

آئینہ بھی عکس اُس کا بنا پایا نہ اُس سا
کیا نقش ہیں جو اُس کے خدوخال میں اُترے

تم سوئے فلک مجھ کو کہاں ڈھونڈ رہے ہو
اک عرصہ ہوا ہے مجھے پاتال میں اُترے

شاید کہ ملے نور کی کرنوں کی سلامی
آنگن میں میرے چاند اسی سال میں اُترے

O

چھاؤں کی طرح دشت میں کس کے ثواب آگئے
جب بھی زمیں دہک اُٹھی سر پر سحاب آگئے

تیرا پیام کیا ملا فصلِ خزاں میں بھی مرے
دل کی اُداس شاخ پر جیسے گلاب آگئے

بوئی ہے کس نے تیرگی دن کے سفید کھیت میں
بستی پہ میری کس لیے شب کے عذاب آگئے

ایسے کہی ہے دھوپ سے دریا نے اپنی داستاں
غم تھے جو سطحِ آب پر بن کر حباب آگئے

کرب و بلا کا سلسلہ جاری ہے کس گناہ پر
کس ظلم پر فگار ہم، زیرِ عتاب آ گئے

○

دید کے بدلے سدا دیدۂ تر رکھا ہے
ہم کو کیوں راندۂ درگاہِ نظر رکھا ہے

شب کی دہلیز سے اُس سمت ہیں راہیں کیسی
پردۂ خواب میں یہ کیسا سفر رکھا ہے

سایۂ وصلِ محبت کی وہ خلوت نہ سہی
یہ بھی کافی ہے خیالوں میں گزر رکھا ہے

کتنے اَوصاف مجھے اپنے عطا اُس نے کیے
ذوقِ تخلیق دیا مجھ میں ہنر رکھا ہے

شاخ در شاخ تری یاد کی ہریالی ہے
ہم نے شاداب بہت دل کا شجر رکھا ہے

ہر گھڑی مجھ پہ نئے اور جہاں کھلتے ہیں
سو بھی جاؤں تو کھلا ذہن کا در رکھا ہے

اُس کی قدرت ہے جسے جیسا بھی تخلیق کرے
شکر ہے اُس کا مجھے اُس نے بشر رکھا ہے

○

دل کا اُجڑا جہان ہوتا ہے
ہجر ایسا ہی جان ہوتا ہے

سوچتا ہوں تو تیری باتوں پر
روشنی کا گمان ہوتا ہے

دیکھنا کس طرح سے دھرتی پر
سرنگوں آسمان ہوتا ہے

تو نہیں ہے تو کتنا تنہا ہوں
ساتھ یوں تو جہان ہوتا ہے

دل کی ناؤ پہ تیری یادوں کا
ہر گھڑی بادبان ہوتا ہے

اب تو تکتا ہوں آئینہ جب بھی
خود پہ تیرا گمان ہوتا ہے

○

اب تو نیلام مری ذات ہوئی جاتی ہے
دیکھ کیا صورتِ حالات ہوئی جاتی ہے

دل میں صحرا ہے کہ جو میلوں تلک ہے پھیلا
اس لئے آنکھ سے برسات ہوئی جاتی ہے

گرد نے ڈھانپ رکھی ہے یوں خلاء کی وسعت
گم ستاروں کی وہ بارات ہوئی جاتی ہے

منکشف جب سے ہوئی ہے میری دنیا مجھ پر
ذرّے،ذرّے سے مری بات ہوئی جاتی ہے

تُو ملا ہے تو فضا ایسے نئی رنگوں سے
جس طرف جاؤں دھنک ساتھ ہوئی جاتی ہے

سچ تو یہ ہے

مسلسل دھوپ ہے
اور
پگھلتا آسماں ہے
اور میں ہوں ۔۔۔۔ یا سفر ہے
دھول ہے کہ دھیرے دھیرے
ڈھانپتی جاتی ہے مجھ کو اپنی چادر میں
نہ ماتھے پر کوئی بوسہ
نہ کوئی پرسشِ احوال کرتا ہے

تھکاوٹ کھا رہا ہوں، چل رہا ہوں
پر مجھے رکنا نہیں ہے
میں یہ بھی جانتا ہوں
زندگی کو کھا رہی ہے وقت کی دیمک
کسی لمحے بدل سکتا ہے مٹی میں بدن میرا
مگر پھر بھی مجھے رکنا نہیں ہے
مجھے اس بانجھ دھرتی سے بہت آگے نکلنا ہے
جہاں پر میری نسلیں
سبز لمحوں کی حسیں فصلیں اُگائیں گی
مجھے بھی بھول جائیں گی
مگر جب ان کے چہرے
زندگی کی روشنی سے تمتمائیں گے
شفق گالوں پہ ناچے گی
تو بادل کو ہٹا کر آسماں سے میں بھی دیکھوں گا
انھیں آواز دوں گا
یہ کہوں گا!
کہ "میرے خون نے بخشی ہے تم کو یہ توانائی
تمہاری چھاؤں کی خاطر
جلایا تھا بدن میں نے
میری خاموشیوں نے تم کو یہ آواز بھیجی ہے"
وہ میری بات سن کر
اک نظر بس آسماں کی سمت دیکھیں گے
پھر اپنی گفتگو میں
مجھ کو یوں ہی دفن کر دیں گے

سوتم سے کیا گلہ کرنا

ہمیں معلوم ہے
اورآگہی ہے اپنی ہستی کی
سوتم سے کیا گلہ کرنا
تمہاری کم نگاہی کا
کہ ہم نے تو
کئی برسوں سے خود کو ایک لمحہ بھی
کبھی مڑ کر نہیں دیکھا

کہاں پر رکھ کے آئے تھے
کہاں پر رہ گئے تھے ہم
کبھی محسوس ہوتا ہے
کئی ٹکڑوں میں بکھرے ہیں
کہیں سرسوں کی خوشبو میں
کہیں دریا کی موجوں میں
کہیں جہلم کی سڑکوں پر
یہ تم نے ٹھیک سوچا ہے
ادھورے آدمی سے بھی
کوئی رشتہ بناتا ہے
کہ ہم تو
رات کی آنکھوں سے ٹپکے ہیں
پڑے ہیں دانہ، دانہ
قطرہ، قطرہ گھاس پر جن کو
پروئے گی کرن آ کر
فنا کی لمبی مالا میں
سوتم سے کیا گلہ کرنا
تمہارے ہار میں
ہم ایسے موتی کی
جگہ کب ہے!

تمنا کے جزیرے پر

تمنا کے جزیرے پر
اُداسی راج کرتی ہے
مرے ہاتھوں کے ہالے میں
نہ کوئی چاند اُترا ہے
نہ کوئی نور پھیلا ہے
نظر کی رہ گزر پر تو
اندھیرا ہی اندھیرا ہے
کبھی تو اس طرح ہوتا

کوئی تو منتظر ہوتا
ذرا تاخیر ہوتی تو
بگڑ کر مجھ سے وہ کہتی
کہاں پر رہ گئے تھے تم
میں پچھلے پانچ منٹوں میں
تمہارے انتظار و کرب کی سولی پہ لٹکی ہوں
ملے ہو اب تو لگتا ہے
گذشتہ پانچ منٹوں میں
کئی صدیاں گزاری ہیں
میں جیسے مر چکی تھی
پر تمہاری اُنگلیوں میں
کیسا جادو ہے
کہ چھوتے ہی بدن میں
زندگی پھر جاگ اُٹھی ہے!
وہ ہوتی ساتھ تو
رستے سکڑتے ہی چلے جاتے
وہ ہنستی تو میں اس کے قہقہوں کی بارشوں میں
بھیگتا جاتا
ابھی لیکن ۔۔۔
تمنا کے جزیرے پر
اُداسی راج کرتی ہے

○

قتل گہہ میں جو ہوا وہ حادثہ اچھا لگا
مجھ کو اپنے ہی لہو کا ذائقہ اچھا لگا

چھوڑیے سچ کیا ہے لیکن صبح کے اخبار میں
درج جیسا بھی ہوا وہ واقعہ اچھا لگا

یہ تعلق بھی تو اپنا ریت سے اب بھر گیا
جب تلک جذبوں کا یہ دریا بہا اچھا لگا

اُس کی آنکھوں میں یہ آنکھیں قید ہو کر رہ گئیں
مدتوں کے بعد کوئی پھر بڑا اچھا لگا

اُس کو چوما تو مرے لب روشنی سے بھر گئے
وصل کا تھا یہ نشہ یا معجزہ اچھا لگا

خواب بونا ہے نیا، خواہش اُگانی ہے کوئی
فصلِ گُل نے پھر کیا ہے رابطہ اچھا لگا

O

کفن میں ڈھل کے جو چرخے کا سوت بولے گا
ہر ایک گھر میں اجل کا سکوت بولے گا

نکل کے آئیں گے قبروں سے دفن لاشے جب
جہاں جہاں پہ نہاں ہے ثبوت بولے گا

ملے گا اذن جو متروک و گنگ لفظوں کو
تو شہرِ جبر کا ہر اک اچھوت بولے گا

ملیں گے خوف کے سائے اُداس سڑکوں پر
جو بے سبب مرے اُن سب کا بھوت بولے گا

O

نہ اپنی کامرانی کا نہ تیری ہار کا موسم
فقط اچھا ہے دنیا میں وفا کا، پیار کا موسم

کہیں حالات کی سولی، کہیں پر ذات کا مقتل
مسلسل چل رہا ہے ساتھ میرے دار کا موسم

رُپوں کے باٹ سے اب تولے جاتے ہیں تعلق بھی
گھروں تک رفتہ رفتہ آگیا بازار کا موسم

قبیلے کی وراثت زرد پتے سوکھے دریا ہیں
ہمیشہ سے یہ فصلِ گل تو ہے سردار کا موسم

ضمیرِ آدمی ہے جل بجھی تہذیب کا نوحہ
فقط اک گرد بن کر رہ گیا کردار کا موسم

فراق و ہجر کی راتیں مرے دن یخ اُداسی کے
کہاں پر کھو گیا جانے وصالِ یار کا موسم

وہاں ہوں میں جہاں جذبات کے بھی دام لگتے ہیں
بڑا سرسبز ہے رشتوں کے کاروبار کا موسم

(ریوڑ لفظ کا استعمال دانستہ ہے)

O

آنکھوں کو شناسا کوئی چہرہ نظر آئے
اس شہر میں اک شخص تو اپنا نظر آئے

میں کس سے کہوں میری یہاں کون سنے گا
ہر آدمی پتھر سے تراشا نظر آئے

ہاتھوں پہ لکیروں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے
کہنے کو تو سورج کہیں تارہ نظر آئے

تم میرے لیے ہجر کی سولی پہ نہ چڑھنا
چن لینا اُسے جو تمھیں اچھا نظر آئے

دن بھر ہی لہو چاٹتے رہتے ہیں مسائل
تب شام کو گھر کا مجھے رستہ نظر آئے

O

آنکھوں سے خواب چھین کے بنجر بنا دیا
کس رُت کو میری خاک کا محور بنا دیا

کچھ تو مرے لہو میں بغاوت کی خو بھی تھی
کچھ وقت کے سلوک نے خود سر بنا دیا

فتویٰ گری سے آگے کبھی بڑھ سکے نہ لوگ
تابع ہوا نہ جب کوئی کافر بنا دیا

سبزہ جہاں جہاں تھا وہاں لال رنگ ہے
تم نے زمیں پہ کیسا یہ منظر بنا دیا

اک خال و خد میں ڈھل گئے اجزائے منتشر
تم نے یہ کیا سے کیا مجھے چھو کر بنا دیا

کس نے ترے جمال کو دی ہے یہ روشنی
تم کو یہ کس نے نور کا پیکر بنا دیا

بخشی ہیں میرے درد نے یہ وسعتیں مجھے
قطرے سے مجھ کو جس نے سمندر بنا دیا

لے کر چلے ہیں مجھ کو جلو میں ترے خیال
یادوں نے تیری مجھ کو تو لشکر بنا دیا

O

کہاں یہ چاہا سدا میری دسترس میں رہے
وہ قید شام و سحر آنکھ کے قفس میں رہے

زمیں میں سینچ وہ پودا کہ جب بھی پھل آئے
ترے خلوص کی لذت ہمیشہ رس میں رہے

دعا یہی ہے کبھی تو الگ نہ ہو پائے
ترا خمار بدن کی ہر ایک نس میں رہے

میں شاخ شاخ سے پھوٹوں نئی نمو لے کر
مجھے مٹا کے اجل میرے پیش و پس میں رہے

تری تلاش میں نکلے ہیں اپنے آپ سے ہم
ترے جنوں میں کہاں ہم بھی اپنے بس میں رہے

○

چلنا ہے مجھے وقت کی رفتار سے آگے
اب دیکھنا ہے دیدۂ بیدار سے آگے

سولی کی بلندی مری منزل تو نہیں ہے
یہ میرا سفر جائے گا اب دار سے آگے

پوچھا نہ ہمیں جشنِ مسرّت میں کسی نے
ہم لڑتے رہے جنگ میں سالار سے آگے

پیڑوں کا سبھی بور تو رستے میں پڑا ہے
دیکھا نہ بہاروں کو بھی آثار سے آگے

وہ مجھ کو خبر دیتے ہیں احوالِ جہاں کی
جو نکلے نہیں صحن کی دیوار سے آگے

O

سر اُٹھا کر جب کوئی دریا بھی چل سکتا نہیں
ایسی رت میں تو کوئی چشمہ اُبل سکتا نہیں

دھوپ میں شدّت کچھ اتنی ہے کہ صحرا سے ابھی
یہ عذابِ ریگ آسانی سے ٹل سکتا نہیں

مجھ کو چہرے پر یہ پھیلی زردیاں منظور ہیں
میں تمہاری طرح منہ پر خون مل سکتا نہیں

آنسوؤں سے کم کہاں ہو پائے گی یہ تیرگی
اب شراروں کی طرح پانی تو جل سکتا نہیں

چاند کو چھونے کی خواہش دل میں کیوں رکھوں نگار
میں زمیں سے اس قدر اُونچا اُچھل سکتا نہیں

O

گونگے بہرے وقت کو آخر بتانا چاہئے
آدمی کو زندہ رہنے کا بہانا چاہئے

سوکھی لہروں نے کہا ہے برف کی آغوش میں
بے خبر ان پانیوں کو اب جگانا چاہئے

زندگی کٹتی نہیں ہے صرف اک اُمید پر
یہ قیامت جھیلنے کو آب و دانہ چاہئے

دے رہا ہے دستکیں کوئی درِ احساس پر
مجھ کو اپنے آپ میں اب لوٹ آنا چاہیے

نیند کے جنگل میں ڈھونڈو راستہ کوئی خواب کا
اس جہاں کے اُس طرف بھی آنا جانا چاہیے

یہی دعا ہے

یہی دعا ہے
آنے والے سال کا سورج
ہجر کی گہری تاریکی میں
وصل کی روشن کرنیں بھر دے
میری راتیں اُجلی کر دے
یہی دعا ہے
سہمے، سوکھے پیڑوں کی

ہر شاخ ہری ہو
بور پڑے اور اتنے پتے
موسم ٹہنی ٹہنی بانٹے
جن کے سبز بدن کی چھاؤں
ہر اک رنگ و نسل کو دائم
فرحت کے احساس میں رکھے
یہی دعا ہے
آنے والے سال میں
سارے انساں مل کر عہد کریں کہ
سوچوں سے سب گرد ہٹا کر
اک دوجے کا چہرہ دیکھیں
اور ہماری اگلی نسلیں
اس دھرتی پر سبزہ دیکھیں
یہی دعا ہے
نیلا امبر
جھیل کی گہری، گہری آنکھیں
یوں ہی ہمیشہ چمکیلی اور نیلی رکھے
آج ہتھیلی کر کے دلوں کو
مل کر یہ ہی دعائیں کرو سب
ہم پر امن کا
سایا ہو

بے چہرہ

یہ کیسی بارشیں ہیں
جو مرے دل پر برستی ہیں
یہ کیسے موسموں کے خواب
آنکھوں میں اترتے ہیں
یہ کیسے ملگجے، اندھے سویرے
گھر کی ان ٹوٹی منڈیروں پر بکھرتے ہیں
یہ کیسے اَدھ موئے سے پھول ہیں

جو سوچ کی شاخوں پہ کھلتے ہیں
کہ جن سے روح کے دالان میں
ہر سو تعفن پھیل جاتا ہے
یہ کیسی رہ گزر ہے
جو میرے پاؤں سے لپٹی ہے
جدا ہوتی نہیں اک پل
یہ کیا حیرت کدہ ہے ذات کا
جو ہر نئے دن ایک اُلجھن بھیج دیتا ہے
کوئی نادیدہ ہاتھوں سے
گرہ سی اک لگاتا ہے
گرہ میں کھولنا چاہوں
تو میری اُنگلیوں کے ناخنوں سے خون رِستا ہے
میں جب بھی دیکھتا ہوں آئینہ
تو ایک ہیولہ سا اُبھرتا ہے
ہزاروں عکس بنتے ہیں
مگر چہرہ نہیں بنتا!

O

کہاں تک اور خود کو اس طرح ٹوٹا ہوا دیکھوں
خس و خاشاک کی صورت بدن بکھرا ہوا دیکھوں

مسافت میں ملے جتنے بھی منظر ریت میں گم ہیں
میں آنکھوں کے سوا پانی کہیں بہتا ہوا دیکھوں

کوئی لمحہ تو آئے ڈھال کی صورت مری جانب
کمانِ وقت سے میں تیر ہی چلتا ہوا دیکھوں

بصارت قید ہے اک عمر سے بے نور منظر میں
اندھیرا ہی اندھیرا ہر طرف پھیلا ہوا دیکھوں

نہاں ہیں جس کے معنی میں کئی مدہوش تفسیریں
میں تیری آنکھ میں اُس حرف کو لکھا ہوا دیکھوں

گلابوں کے جزیرے کی بھلا کس کو تمنا ہے
فقط اک پھول اپنے صحن میں کھلتا ہوا دیکھوں

عطا کر حوصلہ ایسا مرے جلتے چراغوں کو
ہوا کو شرم سے پتوں میں، میں چھپتا ہوا دیکھوں

O

میں نے جو اُس کو چوم لیا تھا جنون میں
اک روشنی سی بہنے لگی میرے خون میں

اس انتشارِ عشق میں وہ لذتیں ملیں
ممکن نہیں ہے جن کی نُمو بھی سکون میں

میں سوچ میں ہوں گرتی ہوئی چھت کو دیکھ کر
دیمک لگی تھی گھر کے مرے کس ستون میں

جھلسا گئی ہے ایسے مجھے جنوری کی شام
میں یوں جلا نہیں تھا کبھی ماہِ جون میں

کتنے طلسمِ ہوشرُبا ہیں ترے لئے
آ کر کبھی تو جھانک لے دل کے درون میں

O

رُت کوئی شبِ وصل کے آثار دکھائے
آنکھوں کو مری اب تو رُخِ یار دکھائے

ہم لوگ ہیں قبروں کے پجاری ہمیں کیسے
یہ آنکھ کہیں جاگتا کردار دکھائے

ارزاں نہ ہوئے ہم ہی فقط وقت کے ہاتھوں
حالات نے شاہوں کو بھی بازار دکھائے

مانگی تھی کہاں رفعتیں اس طرح سے میں نے
کب میں نے کہا اوج سرِ دار دکھائے

اے ارضِ وطن پوچھ ذرا چرخِ ستم سے
کیوں ظلم کے منظر تجھے ہر بار دکھائے

تاوان

بہت زیادہ مقام والا
جب اپنی کسی جاگیر میں جاتا ہے
تو اُس مہمان کے معنی
راج بہادر کی وہ تھکن ہے
جو غریب مزاروں کی جوان بیٹیاں
رات کے ہم راز اندھیروں میں اپنے بدن پر اُتار کر
غلام زندگی کا قرض ادا کرتی ہیں

صبح خریدی ہوئی آنکھیں
راج بہادر کے چہرے پر
صرف کھلتی ہوئی تازگی دیکھتی ہیں

اپنے گھروندوں کی ٹوٹی ہوئی دیواریں نہیں!
سورج سے بڑا عیاش کون ہے
جو روشنی اور تاریکی کے عوض
مشرق اور مغرب سے تاوان وصول کرتا ہے
اُجالے کی بیٹی صبح
اور رات کی نوخیز شام کے چہرے پر
پھیلی ہوئی حیاء کی شفق دیکھو
اور سوچو
کہ آج تک سورج بوڑھا کیوں نہیں ہوا
راج بہادر تھکا کیوں نہیں!

تیرے بغیر

دن کی منڈیر پہ سرخی ہے
اور دل کے گہرے ساگر میں
پھر یادوں کی طغیانی ہے
احساس کے ساحل پر بکھریں
لمحوں کی خالی سیپیاں ہیں
ہر سیپ ہے جیسے قبر کوئی
آنکھوں میں جنگل پھیلا ہے

اور دور تلک سناٹا ہے
سوچوں کے وحشت خانے میں
کچھ دہکے ہوئے انگارے ہیں
ہم راہِ عشق میں یہ بازی
گو جیت کے اب بھی ہارے ہیں
اک حبس زدہ تنہائی ہے
ایسے میں پلکوں پر آ کر
اک قطرہ نمی کا چیخ اُٹھا
اور ہجر کے جلتے صحرا میں
اک خاموشی سی گونج اُٹھی
ان جلتے بجھتے جذبوں میں
مرے ہونے اور نہ ہونے میں
دن ننگے پاؤں میں چلتا رہا
کرنوں کے گھاؤ سہتا رہا
پھر سرمئی شام کے خیمے میں
سوئی رات کے کانٹوں پر
تھک ہار کے سورج ٹوٹ گرا
اور شب کی کالی چادر پر
ہر جانب خون سا بکھر گیا
اک اور میرا دن قتل ہوا

کہیں پہ ہجر کہیں قربتوں کا موسم ہے
ہزار رنگ لیے چاہتوں کا موسم ہے

نہ جانے کون سا لمحہ بدل دے منظر کو
فضا کو گھیرے ہوئے وسوسوں کا موسم ہے

اسی سے قرب کی کونپل نکلنے والی ہے
ہمارے درمیاں جو فاصلوں کا موسم ہے

ذرا سی دھوپ بھرو آ کے میری آنکھوں میں
بہت دنوں سے یہاں بارشوں کا موسم ہے

ابھی سلگتی ہوئی ریت پر ہے میرا سفر
ابھی تو پیروں تلے آبلوں کا موسم ہے

یہ منزلیں تو پڑاؤ ہیں حوصلہ ہیں فقط
مری بقا تو رواں راستوں کا موسم ہے

کئی دنوں سے تمہاری تلاش ہے مجھ کو
کہ جسم و جاں میں عجب خواہشوں کا موسم ہے

میں آدمی ہوں عداوت میں پھل سکوں گا کہاں
کہ مجھ کو راس کہاں نفرتوں کا موسم ہے

O

یہ گل ہوتے ہوئے شعلے سے کوندیں بجلیاں کیسی
دیئے سے کر گئی جانے ہوا سرگوشیاں کیسی

جنھیں ہو علم اب کے ڈوب جانا ہی مقدر ہے
سرِ ساحل پھر اُن کے واسطے ہیں کشتیاں کیسی

ہلاتا ہاتھ کیسے کیا تمھیں لکھتا ہواؤں میں
بریدہ بازوؤں پر ہاتھ کیسے اُنگلیاں کیسی

دیا ہوں میں نہ ٹہنی سے کوئی ٹوٹا ہوا پتہ
تعاقب میں مرے پھر بھی ہیں جانے آندھیاں کیسی

درونِ ذات اُتری ہے کوئی تو شام جذبوں کی
تری آنکھوں میں گہری ہو رہی ہیں سُرخیاں کیسی

درختوں سے کوئی تو ہے تعلق ان ہواؤں کا
یہ پتوں کے لبوں پر بج رہی ہیں سیٹیاں کیسی

O

وہ چاند چہرہ کبھی میرا آئینہ نہ ہوا
اسی لیے تو مرا خود سے سامنا نہ ہوا

تری پکار پہ سب شہر ہی اُمڈ آیا
مری صدا کا کسی پر اثر ذرا نہ ہوا

بس اتنا سوچ کے اُٹھ آیا تھا خموشی سے
میں خستہ حال تیری بزم میں ہوا نہ ہوا

بنیں گے راکھ بدن دھوپ کی تمازت سے
زمیں سے ختم جو پیڑوں کا کاٹنا نہ ہوا

سمٹ ہی جائے گا رستہ چلے جو ہم دونوں
زمیں کا فاصلہ تو کوئی فاصلہ نہ ہوا

اندھیری رات میں تنہا ہی چل پڑا ہوں فگار
سفر میں ساتھ مرے جب کوئی دیا نہ ہوا

O

وہ آفتابِ آگہی اُبھرا نہیں ابھی
شب کا سیاہ قافلہ گزرا نہیں ابھی

بے نقش تیرے چاک پہ صدیاں گزر گئیں
اے میرے کوزہ گر، مجھے سوچا نہیں ابھی!

کچھ اور چھیل دے مرا سینہ، تو شامِ غم
یہ گھاؤ اُس کی آنکھ سا گہرا نہیں ابھی

دل میں اُتار سوختہ صدیوں کی تشنگی
ذرّے میں آئی وسعتِ صحرا نہیں ابھی

ہے ساتھ میرے شام و سحر آج بھی فگار
وہ شخص دُور جا کے بھی بچھڑا نہیں ابھی

O

خلا میں جب کسی تارے کا دم نکلتا ہے
سیاہ رات کی آنکھوں سے نم نکلتا ہے

ترے مزاج کی تلخی گھلی ہے لفظوں میں
تو بولتا ہے تو باتوں سے سم نکلتا ہے

جھکا ہوا ہے زمیں پر ازل سے نیلا فلک
نہ وصل ہوتا ہے اس کا نہ خم نکلتا ہے

جہاں بھی دھڑکنیں رک کر پڑاؤ کرتی ہیں
وہیں سے راستہ سوئے عدم نکلتا ہے

لہو کی طرح رواں ہے بدن میں شام و سحر
اب اتنا سہل کہاں دل سے غم نکلتا ہے

○

فقط خوابوں کے سندیسے مری آنکھوں میں آتے ہیں
پھر اس کے بعد پلکوں پر، ستارے ٹوٹ جاتے ہیں

ابھی اے دوست ان میں رنگ بھرنا تو نہیں ممکن
چلو ساحل کی گیلی ریت پر خاکے بناتے ہیں

بھٹک کر آ گیا ہوں آج پھر ماضی کے جنگل میں
مرے پیروں تلے یادوں کے پتے سرسراتے ہیں

کوئی ننھا سا تارا بھی نہیں تاریک راہوں میں
ہتھیلی پر تو کتنے چاند سورج مسکراتے ہیں

ضعیفی اُن کی کچی سوچ کا خوں چاٹ لیتی ہے
جو بچے چھوٹی عمروں سے ہی اپنے گھر چلاتے ہیں

زمیں کا بوجھ کندھے سے اُتر جائے تو یہ سوچوں
فرشتے آسماں پر کتنی صدیوں سے بلاتے ہیں

O

چمکتی اوس کی صورت گلوں کی آرزو ہونا
کسی کی سوچ میں رہنا کسی کی جستجو ہونا

وہ پتھر ہے پگھلنے میں ذرا سا وقت تو لے گا
ابھی ممکن نہیں ہے اُس سے کوئی گفتگو ہونا

اُسے میں دیکھتا جاؤں کہاں یہ تاب آنکھوں میں
نہیں آسان سورج کے مسلسل روبرو ہونا

تمہاری یاد کی بارش برستی ہے مرے دل پر
مری آنکھوں کو آتا ہی نہیں ہے بے وضو ہونا

اُسے آتا ہے لمحوں میں بھی اپنے عکس کو بھرنا
نہ ہونا پاس لیکن پھر بھی میرے چار سو ہونا

لہو میں بو گیا ہے قطرہ قطرہ سینکڑوں کانٹے
ہری رُت میں بھی میری شاخِ گُل کا بے نمو ہونا

O

نا رسائی کی یہ حسرت نہیں جانے والی
تجھ سے دوری کی شکایت نہیں جانے والی

روز خورشید نیا اذنِ سفر دیتا ہے
میری قسمت سے یہ ہجرت نہیں جانے والی

تجھ کو دیکھا تو کئی اسم کھلے ہیں مجھ پر
اب مری آنکھ سے حیرت نہیں جانے والی

میں فلک زاد تھا، اور خاک کے اس پیکر میں
کیوں ہوا قید، یہ ذلت نہیں جانے والی

دل میں آتے ہی سبھی حرف سخن کرتے ہیں
اب تو اظہار کی قدرت نہیں جانے والی

ہائے میں رو نہ سکا جس گھڑی رونا تھا مجھے
بے بسی کی یہ اذیّت نہیں جانے والی

O

رستے میں جب اک انہونی پڑ جاتی ہے
کانٹوں میں یہ زیست پرونی پڑ جاتی ہے

پیچھے مڑ کر دیکھتا ہوں تو دل کٹتا ہے
بیٹھے، بیٹھے آنکھ بھگونی پڑ جاتی ہے

مستقبل کو چہرہ دینے کی کوشش میں
اپنی صورت بھی تو کھونی پڑ جاتی ہے

کبھی، کبھی دریا کے بھرم کی خاطر بھی تو
اپنی ناؤ آپ ڈبونی پڑ جاتی ہے

دہقانوں کو ہری بھری فصلوں کے ساتھ
اپنے بخت کی بھوک بھی بونی پڑ جاتی ہے

ماں کی گود سے نیچے پاؤں رکھتے ہی پھر
لمحہ، لمحہ عمر یہ ڈھونی پڑ جاتی ہے

O

زیست کتنی کڑی ہوئی ہے یہاں
سب کو اپنی پڑی ہوئی ہے یہاں

آنکھ سے روشنی نکلتی ہے
یاد تیری جڑی ہوئی ہے یہاں

کتنا سنسان ہے یہ شہر اب تو
اک اداسی پڑی ہوئی ہے یہاں

صبح کے ساتھ تیرگی سی جو ہے
راکھ شب کی جھڑی ہوئی ہے یہاں

دل سے اس کا نکلنا مشکل ہے
تیر جیسی، گڑی ہوئی ہے یہاں

O

بدن کے عارضی، خستہ مکاں سے نکلا ہوں
ابھی، ابھی تو ترے خاکداں سے نکلا ہوں

یہ زندگی کے تقاضے، عجب تقاضے ہیں
میں جان دے کے بھی کب امتحاں سے نکلا ہوں

یہ سرکشی بھی مجھے تو نے ہی عطا کی تھی
میں جس گنہ پہ ترے آسماں سے نکلا ہوں

کہانی ختم ہوئی، دن نے کھول لی آنکھیں
کہاں میں اب بھی تیری داستاں سے نکلا ہوں

میں اپنی روشنی کو آزمانے کی خاطر
اے آسمان ! تری کہکشاں سے نکلا ہوں

O

زندگی کتنی کم نظر ہے یہاں
شاخِ اُمید بے ثمر ہے یہاں

میری آنکھوں میں پھول کھلتے تھے
اب تو پانی کی رہ گزر ہے یہاں

اُڑنے والوں کو کیا خبر اس کی
اک پرندہ شکستہ پر ہے یہاں

طالبِ خیر ہوں خداوندا
چار سو کتنا شور و شر ہے یہاں

O

فگار دل میں بھڑکتے خیال رہتے ہیں
اسی لئے مرے خوں میں اُبال رہتے ہیں

گھروں کی سہمی ہوا آنسوؤں سے سیلی ہے
گلی میں دوڑتے پھرتے ملال رہتے ہیں

ہوا ہے، یا یہ کوئی مہ جبین مستی میں
ہیں پیڑ دشت میں یا خوش جمال رہتے ہیں

ابھی تو بات میں پہلا پڑاؤ آیا ہے
ابھی تو ذہن میں کتنے سوال رہتے ہیں

مرے وجود سے پہلے فگار اس گھر میں
ازل سے میرے عروج و زوال رہتے ہیں

○

بدن کی آگ پہ ہاتھوں کو تاپنے کے لئے
پڑی ہوئی ہے ابھی رات جاگنے کے لئے

چلا رہا ہے کوئی تیز دھار لمحوں کو
ہماری عمر کی رسی کو کاٹنے کے لئے

ہوا کے دوش پہ رکھنے پڑیں گے پاؤں مجھے
زمیں کی قید سے اک روز بھاگنے کے لئے

لہو کے شور میں خاموشیوں کے بین سنے
کسے ہیں فرصتیں اس دل میں جھانکنے کے لئے

میں اپنی آنکھ کا کاسہ اُٹھا کے لایا ہوں
سیاہ رات سے اک خواب مانگنے کے لئے

○

مانا عدو سے بر سرِ پیکار میں نہیں
میدان چھوڑنے کو بھی تیار میں نہیں

کس نے کہا ہے خاک سے اُٹھنا نہیں مجھے
کس نے یہ کہہ دیا کہ فلک پار میں نہیں

مسمار کرنا چاہتا ہے کس لئے مجھے
اس عہدِ نو کی راہ میں دیوار میں نہیں

مجھ کو نہ دیکھ شک بھری چھبتی نگاہ سے
جو تو سمجھ رہا ہے مرے یار میں نہیں

شب بھر رہا ہوں میں تری فرقت کے دشت میں
یہ مت سمجھ ملول و عزادار میں نہیں

میں نور بانٹتے ہوئے دن کا رفیق ہوں
شب کی سیاہیوں کا طرفدار میں نہیں

جو کچھ لکھا تھا بخت میں، میں نے کیا نگار
جو کچھ ہوا ہے، اس کا گنہ گار میں نہیں

ریپلیسمنٹ

ابا جی
اپنے جیتے جی
جانے کب مجھ میں منتقل ہوئے
علم نہیں!!!
اس مستقل پڑاؤ کا انکشاف
ایک صبح کام پر جاتے ہوئے
اُس وقت ہوا

جب نئی شرٹ خریدنے کا خیال آتے ہی
میں نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے
جینز کی جیب میں رکھے ہوئے پیسوں کو گنا
لیکن اگلے لمحے ہی
کسی نے کان میں آہستہ سے کہا
کہ گھر کی کچھ ضرورتیں اور بھی ہیں
جو اس شرٹ سے زیادہ اہم ہیں
یہ آواز سنتے ہی
میں نے پیسوں کے ساتھ یہ خواہش بھی
جیب کے پاتال میں دبا دی
اس نئے تجربے نے
میری دل میں وہ درد بھرا
کہ تنگ گلی میں چلتے ہوئے
مجھے اپنی آنکھوں کے کونے
صاف کرنے کے لئے
آخر -------
رومال نکالنا پڑا!!!

وراثت

میرے گھر کے درختوں پر
تعبیریں نہیں لگتی تھیں
سو میری ماں میرے سکول کے پہلے دن سے
میری جیبوں میں خواب بھرتی رہی
کہ شائد میرا باپ ہر شام
زندگی کے بازار میں لٹنے کے بعد
صرف خواب بچا پاتا تھا

ماں یہ امانت سنبھال نہ پاتی تو مجھے سونپ دیتی
خواب اتنے پھلے کہ زندگی چھوٹی لگنے لگی
بہت بیج بوئے مگر باپ کے آنگن کی طرح
میرا صحن بھی بے ثمر رہا
تعبیر کی بارش کبھی نہ برسی
جتنے بیج بوئے انہیں کڑھنے سے فرصت نہ ملی
تو انہوں نے زمین کے ساتھ مل کر خودکشی کر لی
ماں اب مجھے سبز کرنا چاہتی ہے
مگر میں اُن لمحوں کے خوف سے لرزاں ہوں
جب مجھے یہ خواب اپنی جیب سے نکال کر
کسی اور جیب میں بھرنا ہوں گے
جس کا میری طرح
سکول کا پہلا دن ہوگا

زندگی سے مکالمہ

نذرِ ساقی
میرے ہاتھ پہ بنتی ٹوٹتی
دنیا سے بیزار لکیر!!
مجھے خبر ہے
وقت کے ساتھ تو ملی ہے
اسی کی شہہ پہ
تو نے مجھ سے بغاوت کی ہے

اور بے رحمی کی ڈوری سے
میرے دونوں ہاتھ
پشت کے پیچھے باندھ دیئے ہیں
اور اب میری دونوں آنکھیں
میرے پاؤں میں ایسی گڑی ہیں
آس، پاس کے سارے منظر
اُنگلی، اُنگلی
ناخن، ناخن
سمٹ گئے ہیں
آگے، پیچھے کی آوازیں
سن سکتا ہوں
لیکن ان آوازوں کے
چہرے دیکھنا مشکل ہے
تو نے آزادی کی خاطر
مجھ کو مشکل کی اس گہری تاریکی میں قید کیا ہے
لیکن تجھ کو خبر نہیں ہے
میری آنکھوں کے پیچھے بھی اک رستہ ہے
جس پر میری تازہ سوچیں
ہر اک لمحہ نور بکھیرتی رہتی ہیں
اُس رستے کے اَنت پہ میری
فکر کا وہ دریا ہے

جس میں
صدیاں
لہریں بن کر بہتی ہیں
اِن لہروں کی بوند، بوند میں
تھک ہار کے
وقت پڑاؤ کرتا ہے
کچی مٹی کے کمرے میں
رہنے والی بے صبری!!
تو اس بھید سے ناواقف ہے

O

کوئی بھی لفظ نہ نکلا تھا ترجمانی کو
سو میں نے سونپ دیا درد کھارے پانی کو

مجھے یہ ریت تو سیراب کرتی رہتی ہے
دوام بخش دے صحرا کی بے کرانی کو

میں گھر کی سوختہ الماریوں کے سینے میں
چھپا کے آیا تھا سب خواب اور جوانی کو

صریرِ نوکِ قلم فکر ملتمس ہے مری
یقین بخش دے میرے خیال و معنی کو

فگار شہر میں نکلے ہیں چند اہلِ سخن
سروں پہ باندھ کے دستارِ خوش گمانی کو

O

لمحہ بھر حسرتِ دیدار میں آ بیٹھے ہیں
سایہء گیسوئے دلدار میں آ بیٹھے ہیں

پھر کئی رنج بجھی شام کی انگلی پکڑے
جانے کب اشکوں کی اس دھار میں آ بیٹھے ہیں

میں جنھیں رات کے حجرے میں ہی چھوڑ آیا تھا
خواب وہ دیدہء بیدار میں آ بیٹھے ہیں

دائرے گھومتے رہتے ہیں مرے چاروں طرف
مسئلے وقت کی پرکار میں آ بیٹھے ہیں

جانے کب کھینچ لے گی قبر ہمیں سینے میں
فیصلے موت کی تلوار میں آ بیٹھے ہیں

شاملِ جنسِ نمائش ہوئے ہیں لوگ مرے
گھر سے اٹھ کر سبھی بازار میں آ بیٹھے ہیں

در بدر ہونے نہیں دیتا کبھی عشق ہمیں
خود سے نکلے ہیں تو ہم یار میں آ بیٹھے ہیں

O

''میں'' کے اندر کتنے ''ہم'' ہیں
جسم میں کتنی روحیں ضم ہیں

ڈھونڈتا رہتا ہوں ہر لمحہ
وہ سب رنگ، جو مجھ میں کم ہیں

تیری سوچوں کی حد سے بھی
کتنے آگے میرے غم ہیں

دل میں بارش کا موسم ہے
اسی لئے تو آنکھیں نم ہیں

کون مکیں ہیں میرے اندر!!
ابھی تو ان سے رابطے کم ہیں

صدیوں سے ہوں سفر میں لیکن
حوصلے آج بھی تازہ دم ہیں

O

ہم پر یہ احسان اترتا رہتا ہے
ہجرت کا سامان اترتا رہتا ہے

ہر اک سانس سے اس کی خوشبو آتی ہے
دل میں وہ ہر آن اترتا رہتا ہے

جانے کیسی خوش فہمی میں دھرتی پر
فلک سے یہ انسان اترتا رہتا ہے

ہم ہی تولے جاتے ہیں معیاروں پر
ہم پر ہی میزان اترتا رہتا ہے

دل کے غار میں روشنی رہتی ہے، جب سے
اس میں تیرا دھیان اترتا رہتا ہے

رگ، رگ میں امیدیں بہتی رہتی ہیں
جینے کا امکان اترتا رہتا ہے

کارِ ہنر بھی سوچنے کا خمیازہ ہے
جیون بھر تاوان اترتا رہتا ہے

استقبال

یہ جتنی گفتگو تم سے ہوئی ہے فون پر میری
ابھی تو کچھ نہیں جاناں
یہ سارے استعارے ہیں
میری اُن خواہشوں کے
جو تمہارے نام سے منسوب ہیں
اور دل میں رکھی ہیں
نہ جانے کتنی صدیوں سے!

ابھی کتنے ہی خوابوں کے جزیرے ہیں
جنھیں آباد کرنا ہے
تمہاری آنکھ سے کچھ نور لے کر
اُن جزیروں کی سیاہی دور کرنی ہے
ابھی تو یہ بتانا ہے
کہ میرے خون کے ہر ایک دھارے میں
تمہاری یاد بہتی ہے
زمیں پر پاؤں رکھتی ہو
تو اُس کی چاپ مجھ کو
روح میں محسوس ہوتی ہے
ابھی آغاز کرنا ہے
ابھی دیوانگی کی سرحدوں کے پار جانا ہے
حسیں جذبوں کی پھیلی اَن چھوئی دنیا کے دروازوں کو
تم پہ کھولنا ہے---یہ بتانا ہے
تمہیں میں جانتا ہوں
اُس الوہی ایک لمحے سے
جو صدیوں کا سفر کر کے ہمارے پاس پہنچا ہے
وہ لمحہ جب کہ روحوں نے
ہمارے جسم کا ملبوس پہنا تھا
تمہیں کیا یاد ہے
اس پل مرے ہمراہ تم بھی تھیں

میں چہرہ اُوڑھ کر
جس دن سے اس دھرتی پہ اترا ہوں
دنوں کی جیب میں
پہچان کے اُس پل کو ڈھونڈا ہے
تمہاری کھوج میں کتنے زمانوں سے میں گزرا ہوں
تمہیں تب جا کے پایا ہے
یہ خوابوں سے بھری آنکھیں
محبت سے بھرا دل
اور اپنی اَن چھوئی دنیا
میں تم کو سونپ دیتا ہوں
کہ صدیوں کا سفر کر کے میری جاں
میرے دل کے پاس پہنچی ہو
میں اس خاکی جزیرے پر
تمہارا آج
استقبال کرتا ہوں!

امیگرنٹ

گھر کی خاطر گھر کو چھوڑا
آنکھیں الماری میں رکھیں
دریا میں سب خواب بہائے
بوڑھے برگد کے سائے میں
اپنے دل کو دفن کیا اور
وقت کی منڈی میں اک دن میں نے
اپنے آپ کو اونے پونے بیچ دیا
سات سمندر پار کیے۔۔۔اور
سرخ گلابوں کے موسم میں
سبز جزیرہ چھوڑ دیا
نیلے پانی کے ساحل پر

کھلی ہوئی آنکھوں سے میں نے
کتنے زندہ خواب کمائے
شام وسحر کی اس عجلت میں
دن بھی مہینوں اور برسوں میں ڈھلتے، ڈھلتے
طول وعرض میں اب تو اتنے پھیل گئے ہیں
جنہیں سمیٹ کے واپس لانا ناممکن لگتا ہے!
چلتے، چلتے آج وہاں پر آ پہنچا ہوں
جس سے آگے گہری دھند ہے

اور عقب میں
اتنے جنگل اُگ آئے ہیں
خاک پہ چلتے پھرتے رستے
پیڑوں کی سانسوں میں گھل کر
ہرے بھرے پتوں کی صورت
پہلے تو شاخوں پر آئے
اور اب سارے
ہوا کے ایک اشارے پر
جانے کدھر کو نکل گئے ہیں!
دھند کی سرحد پر میں بیٹھا
خود کو یونہی سوچ رہا تھا
اک لمحے نے موقع پا کر
دونوں بازو کاٹ دیئے ہیں
اب تو واپس لوٹ کے جانے کے امکان بھی
ان آنکھوں میں قطرہ، قطرہ پگھل رہے ہیں
جیسے حوصلے بکھر رہے ہیں

O

تری خاطر کوئی اک عمر سے رستے میں بیٹھا ہے
مجھے ہر روز سورج اک یہی پیغام دیتا ہے

وہ چہرہ دن کو میری آنکھ کے ساحل پہ رہتا ہے
مگر جب شام ڈھلتی ہے بھنور میں ڈوب جاتا ہے

نہ جانے کیوں مری سوچوں کو قبریں ڈھونڈ لیتی ہیں
مرا ہر خواب جیسے موت کو آواز دیتا ہے

جسے دیکھو وہی بچہ تو گہری سوچ میں گم ہے
نہ ہنستا ہے نہ کوئی ریت کا اب گھر بناتا ہے

خزاں کے ساتھ سازش میں جڑیں ہوں جن درختوں کی
ہری رُت میں بھی اُن شاخوں کا جوبن سوکھ جاتا ہے

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں،
مزید اس طرح کی شاندار، مفید اور نایاب برقی
کتب (Pdf) کے حصول کے لیے ہمارے
وٹس ایپ گروپ میں شمولیت اختیار کریں
ایڈمن پینل
عبداللہ عتیق : 0347-8848884
حسنین سیالوی : 0305-6406067
سدرہ طاہر : 0334-0120123

O

کنارِ آب ملا تھا شفق کا جام لئے
اُچھلتا کودتا دن بازوؤں میں شام لئے

قضا تو ڈھونڈتی پھرتی ہے زیست کو ہر سو
سمے کے رخش پر شمشیرِ بے نیام لئے

سلیم آفتاب فگار کو تعلیمی دور کی نوعمری میں ہی مطالعے کے ذوق و وجدان نے تخلیقی جذبے سے بھر دیا تھا، بہت سے شعراء کا کسی شاعر کی حیثیت میں مختلف شعراء کے شعری مطالعے کی مجموعی صورتِ حال کی بات اور ہے لیکن اپنے شعری اظہار میں میں نے سلیم فگار میں یہ وصف نمایاں پایا ہے کہ کسی دوسرے شاعر کے کلام کی خوشہ چینی یا شعری سٹائل کا تتبع اسے کسی طرح بھی قابلِ قبول نہیں جو کچھ وہ لکھتا ہے اُس میں پوری دیانت کے ساتھ خالصتاً اُس کا اپنا طبع زاد رنگ و اسلوب متصرف ہوتا ہے اس کا اپنا ہی علامتی و استعاراتی ضابطہ، اظہار ہے جو ایک اپنی ہی قسم کے طرزِ خاص کی جمالیات کا عکاس ہے۔ نظم ہو یا غزل، زندہ روایت کے ساتھ جدت طرازی اور جدید تر عصری حسیت اس کے فکر اور جذبے کی لطافتوں کے ساتھ گھل مل کر تخلیق پاتے محسوس ہوتے ہیں، غالباً اسی سبب سے اس کی نظم و غزل کی اکثر لائنیں اور اشعار دامنِ دل چھوئے بغیر نہیں رہتے۔

مجھے مسرت ہے کہ گہری لگن اور ریاضتِ شعر کا عمل سلیم کی تخلیقی کاوشوں کو ایک تدریجی ترفع اور ارتقا کے مدارج سے ہم کنار کر رہا ہے اور وہ اپنی ہم عمر نسل کے جینوئن اور تازہ کار شاعروں کے دوش بدوش شعر و ادب کے نئے امکانات کی طرف پورے اعتماد کے ساتھ گامزن ہے۔

اقبال کوثر

سلیم نے غزلیں بھی لکھی اور نظمیں بھی اور ان دونوں اصناف کو ایک دوسرے میں خلط نہیں ہونے دیا، مجھے دونوں رنگوں میں اُس کے بہت سے اشعار اچھے لگے۔ دونوں وادیوں میں وہ اپنے کھرے پن کا عذاب سہتا نظر آتا ہے۔

خورشید رضوی

اپنی تازہ کاری اور شعری رویے کی نئی تہذیب کے اعتبار سے ”ستارہ سی کوئی شام“ اُردو شاعری کا ایک اہم موڑ ہے۔ شعر و سخن کے قارئین کے لئے اس کا مطالعہ سودمند ہونے کے ساتھ ساتھ ضروری بھی ہے۔

ڈاکٹر طارق عزیز

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS
Book Street, 46/2 Mozang Road, Lahore, Pakistan.
Phone: +92 42 37355323, Fax: +92 04 37323950
e-mail: sanjhpk@yahoo.com, sanjhpks@gmail.com

ISBN:978-96-593-143-1